رانگ نمبر

رضیہ بٹ

www.freepdfpost.blogspot.com

پلنگ

جیراں نے بوسیدہ لکڑی کے کواڑ بھیڑے اور زنگ آلود کنڈی لگا کر صحن میں ایک کچی دیوار سے دوسری کچی دیوار کے ساتھ بندھی رسی سے اپنی پرانی پیوند لگی چادر جو کل شام دھو کر ڈالی تھی' اتاری۔ چادر اوڑھ کر وہ برابر والے نسبتاً" بڑے دالان کی طرف گئی۔ بھابی سکینہ پیڑھی پر بیٹھی سرسوں کا ساگ صاف کر رہی تھی۔

"آ' جیراں" بھابی سکینہ نے دروازے میں کھڑی جیراں سے کہا۔

"بھابی' میں حویلی جا رہی ہوں" وہ ایک قدم دہلیز پر رکھتے ہوئے لجاجت سے بولی۔

"ہوں۔"

"شیرا باہر کھیل رہا ہے۔"

"اسے ساتھ ہی لے جا بی بی۔ یہاں چھوڑ کر نہ جانا۔"

"ہائے بھابی' ذرا دھیان رکھنا اس کا' تنگ کرے تو چنگیر میں روٹی رکھ دی ہے' دے دینا اچھی بھابی اسے یہیں..... رکھ لو ساتھ لے جاؤں گی تو تنگ کرے گا وہاں یہیں کھیلنے....."

"نہ بابا' طوفان اٹھا دیتا ہے چیخ چیخ کر۔ روتا ہے تو سنبھلنے ہی میں نہیں آتا۔ ہرج ہی کیا ہے' تو جاتی ہے تو اسے بھی لے جایا کر۔"

"کئی بار تو بتا چکی ہوں تم سب کو۔"

"ہے ہے' بچہ ہی تو ہے۔ چوہدرانی کے اپنے بچے نہیں ہیں کیا۔"

"بھابی وہ چوہدرانی کے بچے ہیں۔ اور شیرا مجھ غریبنی کا بیٹا ہے۔ پھر تنگ بھی تو کرتا

www.freepdfpost.blogspot.com

ہے وہاں جا کر۔ ادھر سے ادھر دوڑ لگاتا پھرتا ہے۔ اور جو منع کروں تو چوہدری کی بیٹھک میں جا گھستا ہے۔"

"بچہ ہی ہے' کیا ہوا۔ کبھی کوئی نقصان تو نہیں کیا۔ صرف اس کے لال پایوں والے پلنگ ہی کو تو دیکھتا رہتا ہے نا۔ بھابی سکینہ نے ہنس کر آنکھیں مٹکاتے ہوئے کہا تو جیراں نے ایک ٹھنڈی آہ بھر کر کہا "کیا کروں اس کا' سمجھ میں نہیں آتا۔"

"کرنا کیا ہے' بچہ ہے تیرا۔ جہاں جاتی ہے ساتھ ہی تو جائے گا۔ اتنا شوخا ہے' اس کی کون ذمے داری لے۔ پھر جب تو حویلی جاتی ہے' دیکھتی تو ہے کتنی ضد کر کے ساتھ جاتا ہے اور کہیں جائے تو یہاں رہ بھی جاتا ہے لیکن حویلی تو تجھ سے پہلے پہنچنے کی کوشش ہوتی ہے اس کی۔"

جیراں نے مایوس نظروں سے بھابی کو دیکھا پھر دروازے سے باہر نکلتے ہوئے بولی۔

"اچھا میں لے جاتی ہوں اسے۔ ذرا میری کوٹھڑی کا دھیان رکھنا کنڈی لگا دی ہے۔"

"اچھا بھئی اچھا۔ دھیان رکھوں گی..... تالا ہی لگا جایا کر" بھابھی کے لہجے میں تحقیر آمیز تمسخر تھا۔ جیراں نے یہ تحقیر و تمسخر ہمیشہ ہی محسوس کیا تھا۔ یوں لگتا تھا بھابی کہہ رہی ہو رکھا ہی کیا ہے تیری کچی کوٹھڑی میں' ٹین کا ٹوٹا ہوا بکس' مٹی کی کنالی' بوسیدہ چنگیر' جھلنگا سی چارپائی' بوٹی بوٹی کھیس' الگنی پر چوہدرانی کی اترنیں۔ دیوار کی چھتی پر چند پیتل کے برتن آٹے چاولوں کے زنگ آلود کنستر' نمک مرچ کی پرانی شیشیاں اور مٹی کے چولہے کے پاس پڑے سلور اور مٹی کے پیالے' کالی سیاہ ہانڈی اور سلور کی بڑی دیگچی۔ کون سر پھرا اٹھا لے جائے گا یہ جو دھیان رکھنے کی تاکید کر رہی ہے۔"

جیراں دل گرفتہ سی ہو کر مڑی۔ کوٹھڑی پر نگاہ ڈالی' بھابی کے دالان کے بغل میں یہ کوٹھڑی اسے بھابی ہی کی کرم نوازی سے ملی ہوئی تھی۔ گو یہ چھوٹا سا کچا پکا مکان اس کے باپ فضل دین کا تھا لیکن باپ کے مرنے کے بعد بھائی قابض ہو گیا تھا اس پر۔ بڑے دالان میں رہائش تھی۔ صحن اسی کے استعمال میں آتا تھا۔ دالان کے ساتھ والے کمرے میں بھینس کا چارا توڑی رکھا ہوتا اور نکڑ والا چھوٹا سا کمرا جس میں پلنگ اور دو کرسیاں پڑی ہوتیں' بیٹھک کے طور پر استعمال ہوتا۔

جیراں کی شادی ساتھ والے گاؤں میں ہوئی تھی۔ قسمت کھوٹی تھی۔ سسرال والوں نے سکھ کا سانس نہ لینے دیا۔ شوہر راج گیری کا کام کرتا تھا لیکن کمائی لا کر ماں باپ کے ہاتھ پر رکھتا تھا۔ جیراں بے زبان جانور تھی۔ جس سے صبح سے شام تک مشقت لی جاتی' مارا پیٹا جاتا اور پیٹ بھر کر کھانا دینے سے بھی گریز کیا جاتا۔ بات بات پر گھر سے نکال دینے کی دھمکی دی جاتی پھوہڑ اور بے سلیقہ کہہ کر پکارا جاتا اور آئے دن میکے سے کوئی نہ کوئی چیز لانے کی فرمائش ہوتی۔

ماں باپ تھے نہیں بھائی بھی کونسا امیر کبیر آدمی تھا۔ کسی کی زمین پر واہی بیجی کرتا تھا۔ بس گزارہ ہی ہوتا تھا۔ دو تین دفعہ جیراں کو گھر سے نکال دیا گیا۔ میکے میں کون سے سکھ دیکھے تھے بیچاری نے سسرال میں تو اس سے بھی زیادہ درگت بنی۔ پھر بھی شوہر کی چھت تلے بیٹھی تھی۔ بیٹا ہو گیا تھا۔ کولہو کے بیل کی طرح کام میں جتی رہتی۔ سوکھ کر کانٹا ہو گئی لیکن دم سادھے پڑی رہتی جیسے تیسے گزر کرنا تھی۔ یہ گھر شوہر کا تو تھا۔

لیکن شومئی تقدیر جب شیرا صرف دو سال تین ماہ کا تھا' اس کا باپ شہر سے آتے ہوئے ویگن کی ٹکر ہو جانے سے مر گیا۔ بیوگی کا دکھ اپنی جگہ لیکن سسرال والوں نے اس کا جینا حرام کر دیا۔ اس کو منحوس اور سیاہ بخت قرار دیا۔ کلموہی کہہ کر پکارا جانے لگا۔ جانوروں کی طرح سسر اور دیور جیٹھ پیٹنے لگے۔

وہ ایک سال بمشکل وہاں رہ پائی۔ پھر وہاں سے خودکشی کے ارادے سے بھاگ آئی۔

میکے کے گاؤں کے چوہدری نے اس کی یہ کوشش ناکام بنا دی اور پھر اسے اور اس کے معصوم بچے کو گاؤں لا کر اس کے بھائی کے حوالے کر دیا۔ جیراں کے لئے حویلی میں کام مہیا کیا اور چوہدرانی سے اس کا خیال رکھنے کو کہا۔

تب سے وہ اس کوٹھڑی میں رہ رہی تھی۔ حویلی گندم پھٹکنے جایا کرتی۔ ہفتے میں ایک دو بار چوہدرانی اپنے کاموں کے لئے بھی اسے بلا لیا کرتی تھی۔ یوں جیراں اور اس کے بیٹے کا بوجھ بھائی اور بھابی پر نہیں پڑا تھا۔ وہ اپنی کفالت کر رہی تھی۔ زیادہ تو نہیں ملتا تھا۔ ہاں بیٹے کے لئے وہ دودھ روٹی لے ہی لیتی تھی۔ روکھی سوکھی خود کھا لیتی۔

شیرا اب پانچویں سال میں تھا۔ اسکول گاؤں میں تھا لیکن وہ اکھڑ اور ضدی تھا اسکول

www.freepdfpost.blogspot.com

جانے کا نام نہ لیتا تھا۔

"کوئی بات نہیں" سب جیراں سے کہتے "اگلے سال داخل کروا دینا۔ ابھی چھوٹا ہی ہے۔ پڑھنے کو عمر پڑی ہے۔"

جیراں کی دلی خواہش تھی کہ شیرا پڑھ لکھ کر اس قابل ہو جائے کہ آبرو مندانہ زندگی بسر کرے۔ دوسروں کے رحم و کرم پر جیسے وہ پڑی ہے وہ نہ پڑے۔ اسی لئے وہ چاہتی تھی کہ شیرا اسکول جانے لگے لیکن وہ نٹ کھٹ اور ضدی سا تھا۔ مارنے پیٹنے سے بھی راہ پر نہیں آتا تھا۔ سارا دن گلی محلے میں کد کڑے لگاتا پھرتا' گندے تالابوں میں نہاتا چلچلاتی دھوپ میں دوسری گلی کے بچوں کے ساتھ غلیل لئے پھرتا۔

سارا دن وہ کھیلتا رہتا اور اسے ماں کا خیال نہ آتا۔ ہاں بھوک لگتی تو دوڑا آتا "ماں روٹی دے' دودھ پیوں گا" وہ کہتا۔ جیراں مٹی کے پیالے میں دودھ بھر کر اسے پلاتی اور سوکھی روٹی چباتے ہوئے وہ گھونٹ گھونٹ دودھ پینے لگتا۔ بچہ تھا اسے احساس تک نہ ہوتا کہ ماں کے حلق میں کبھی دودھ کا ایک گھونٹ بھی نہیں اترا اور پانی کے ساتھ سوکھی روٹی اسے اکثر نگلنا پڑتی ہے۔

وہ کھیل میں خوش رہتا۔ سارا سارا دن گلی اور کھیتوں میں رہتا۔ گھر صرف بھوک لے کر آتی لیکن جب اسے یہ پتا چلتا کہ ماں حویلی جا رہی ہے تو سارے کھیل چھوڑ چھاڑ بھاگا چلا آتا۔ "ماں میں بھی حویلی جاؤں گا۔"

جیراں اسے جب وہ چھوٹا تھا ساتھ ہی لے جایا کرتی تھی۔ لیکن اب وہ بڑا ہو رہا تھا شرارتی بھی تھا اور حویلی میں اس کے ہم عمر چوہدری کے بچے بھی تھے۔ اس لئے اسے ساتھ لے جاتے ہوئے کتراتی تھی۔ صاف ستھرے اور رنگا رنگ لباسوں میں ملبوس چوہدری کے بچوں میں جب وہ میلے کچیلے کپڑوں اور ننگے پاؤں گھل مل کر کھیلتا تو جیراں چوہدرانی کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات دیکھ لیتی۔ وہ شیرے کو گھسیٹ کر اپنے پاس لے آتی۔ تھپڑ لگاتی چٹکی کاٹتی۔ شیرا گلا پھاڑ کر چیخنے لگتا تو چوہدرانی کانوں کو ہاتھ لگا کر کہتی "اے ہے جیراں' کیوں مار رہی ہے اسے۔ اچھا ہو' گھر چھوڑ آیا کر اسے....."

کبھی وہ جھلا کر کہتی "دیکھ تو اسے' ہاتھ پاؤں کتنے میلے کر رکھے ہیں مٹی میں کھیل

کر' ساتھ لانا ہی ہوتا ہے تو صاف ستھرا کر کے لایا کر۔"

"اے ہے دیکھ تو ذرا' ناک بہہ رہی ہے اور لگا تار الٹے ہاتھ سے رگڑے جا رہا ہے۔ ہاتھ پر پپڑیاں جم گئیں ہیں۔ جیراں بھئی دل خراب ہونے لگتا ہے۔ اسے کچھ تمیز تو سکھا۔"

"اس کا سر دانوں سے بھر گیا ہے۔ ٹنڈ کروا دے۔ پیپ بھرے دانے ہیں۔ کوئی دوائی لا کر لگا اس پر۔"

"جیراں تو ایک بیٹے کو بھی نہیں ٹھیک سے سنبھال سکتی۔ تیرے سسرال والے سچ ہی ہوں گے جو باتیں کرتے تھے تجھے....."

جیراں دل پر صبر کی سل رکھ کر چوہدرانی کی جلی کٹی باتیں سنتی۔ اکثر وہ دکھ اور غصے کا اظہار شیرے کو مار پیٹ کر کرتی۔ کمر پر دھپ لگاتی۔ چانٹوں سے منہ سرخ کر دیتی۔ اسے گندم کے ڈھیر کے قریب سے اٹھا کر دور بیرونی دروازے میں بٹھا آتی۔

"یہاں سے ہلا تو جان نکال دوں گی تیری" وہ گھونسا لگا کر کہتی۔ پھر اس کی ممتا تڑپ اٹھتی۔ اس کے اندر ہی اندر آنسو گرنے لگتے۔ دل بے حد دکھی ہو جاتا اور وہ آنسوؤں کی نمی حلق میں گھلتی محسوس کرتے ہوئے گندم پھٹکنے لگتی۔

شیرا ماں کے کمر موڑتے ہی وہاں سے اٹھ بھاگتا اور سیدھا چوہدری کی بیٹھک کی طرف چلا جاتا۔ بڑی سی بیٹھک جس میں لال اور سبز رنگ کی دری پڑی ہوتی۔ ایک طرف کرسیاں رکھی ہوتیں جن پر اجلی اجلی کڑھائی کی ہوئی گدیاں پڑی ہوتیں۔ میز ہوتی جن پر کروشیئے کے رومال پڑے ہوتے اور سب سے جاذب نظر چوہدری کا لال پایوں والا پلنگ ہوتا۔ دیوار کے ساتھ رنگین منقش پایوں والا سفید تلی سے بنا پلنگ شیرے کو شروع ہی سے اچھا لگتا تھا۔ اس پلنگ پر کبھی چوکور سفید اور کالے خانوں والا کھیس پڑا ہوتا کبھی پیلے اور کالے رنگ کی دوتہی ہوتی۔ پھندنوں والا گاؤ تکیہ ہوتا۔ جس سے ٹیک لگا کر چوہدری بیٹھتا اور لمبی نے والے حقے کے کش لیا کرتا۔

شیرے کا جی للچا جاتا۔ وہ اس پلنگ کو تکتا رہتا۔ اس کا جی چاہتا وہ چوہدری کو دھکا دے کر پلنگ سے ہٹا دے اور خود اس پر لیٹ جائے۔

جیراں جانتی تھی کہ شیرے کو چوہدری کا پلنگ بہت اچھا لگتا تھا اور وہ بیٹھک کی طرف

www.freepdfpost.blogspot.com

جاتا ہی اس لئے ہے کہ اس پلنگ کو دیکھتا رہے۔ کئی بار اس نے موقع پر اسے پکڑا تھا اور کان مروڑتے وہاں سے لے آئی تھی۔

شیرا کان کے درد سے بلبلاتے ہوئے کہتا جاتا تھا "ماں مجھے بھی ایسا پلنگ لے دے نا۔ چوہدری سے کہہ نا یہ پلنگ مجھے دے دے۔ کتنا اچھا پلنگ ہے' میں اس پر سوؤں گا" اور جیراں ڈر جاتی اسے پیار سے سمجھاتی۔ کہتی "کہیں اس پلنگ پر چڑھ نہ جانا کسی دن۔ ایسی پٹائی ہو گی کہ عمر بھر یاد رکھے گا۔ شیرے یہ امیروں کے لئے ہوتا ہے' ہم غریبوں کے لئے نہیں۔ اس پر صرف چوہدری سوتے اور بیٹھتے ہیں۔ تو کبھی اس پلنگ کے قریب بھی نہ جانا۔ بدبختا' کسی دن ایسا کر دیا تو روئی کپڑے سے بھی جائے گا۔ چوہدرانی کو تیرا یہاں آنا پسند نہیں' مجھے بھی نکال دے گی کسی دن..... باز رہ ان باتوں سے....."

لیکن وہ معصوم سا بچا تھا۔ ان بڑی بڑی باتوں اور طبقاتی فاصلوں کو کیونکر سمجھ سکتا تھا۔ اسے تو وہ پلنگ پسند تھا اور وہ اس پر لیٹنا' بیٹھنا اور سونا چاہتا تھا۔ ماں کے ساتھ حویلی آنے میں بھی صرف اسی پلنگ کی کشش کارفرما ہوتی۔ ورنہ وہ کون سا چوہدری کے بچوں سے کھیلنے آتا تھا جو اس کی بہتی ناک اور دانوں بھرے سر سے نفرت کھاتے تھے اور جنہیں ان کی ماں اس کے ساتھ کھیلنے سے سختی سے منع کرتی تھی۔

وقت کے ساتھ ساتھ شیرے کی پلنگ سے انسیت اور لگن بڑھتی جا رہی تھی۔ اب تو وہ بیٹھک میں پلنگ کے قریب ہو کر بھی بیٹھنے لگا تھا۔ ایک دفعہ تو حد ہی ہو گئی تھی۔ جیراں گندم کی بوری فرش پر الٹائے ہوئے چھاج سے گندم پھٹک رہی تھی۔ اس نے شیرے کو اپنے قریب ہی بٹھایا ہوا تھا۔

"ہلنا نہیں یہاں سے شیرے' چوہدرانی مارے گی اگر تو ادھر ادھر گیا تو۔"

اس دن چوہدرانی نے شیرے کے آنے پر کچھ زیادہ ہی ناک بھوں چڑھائی تھی۔ جیراں ڈر گئی تھی۔ روزی کا سوال تھا کہیں ایسا نہ ہو شیرے کی وجہ سے چوہدرانی اس کا داخلہ بھی حویلی میں بند کر دے اور وہ روٹی کے لئے در در کی ٹھوکریں کھاتی پھرے۔ اس گاؤں میں وہ چوہدری کی شرافت اور مہربانی ہی سے تو بیٹھی تھی اور کسی پر بار نہ تھی۔ گندم پھٹکنے اور دوسرے چھوٹے موٹے کام کرنے سے اسے اتنا مل جاتا تھا کہ آرام سے اپنا اور اپنے بچے کا

پیٹ پال رہی تھی۔ اس نے تو چھپا کر ایک گولک بھی رکھی ہوئی تھی۔ جب چوہدرانی اسے تو پیسے دیتی یا کسی بچے کا صدقہ خیرات بانٹتی تو جیراں ضرورت کے پیسے رکھ کر فالتو اس گولک میں ڈال دیتی۔ کونے میں زمین کھود کر اس نے گولک دبا رکھی تھی۔ اوپر ٹوٹا پھوٹا چادر کا بکس رکھ دیتی تھی۔ یہ پیسے وہ شیرے کے لئے جمع کر رہی تھی۔ کل کو اسے اسکول جانا تھا' تعلیم حاصل کرنا تھی۔ اس کے لئے پیسے چاہیں تھے۔ وہ یہ پیسے چپکے چپکے جمع کر رہی تھی۔ گو بچت زیادہ نہ تھی پھر بھی اسے امید تھی کہ وہ بچے کے تعلیمی اخراجات پورے کر لیا کرے گی۔

شیرے کی وجہ سے حویلی میں آنا جانا بند ہو گیا تو اس کے سارے خواب ٹوٹ جائیں گے۔ کون اس کا خرچہ اٹھائے گا۔ کون گولک میں ڈالنے کے لئے پیسے دے گا۔ کرموں جلی جیراں انہی باتوں سے خوفزدہ ہو کر شیرے کو مارا پیٹا کرتی تھی۔ پھر خود ہی بلک بلک کر رویا بھی کرتی تھی۔ مامتا اپنا آپ منوا لیا کرتی تھی۔ اس دن اس نے شیرے کو ڈانٹا ڈپٹا اور پاس ہی بیٹھے رہنے کی تلقین کی۔ وہ گندم پھٹک پھٹک کر ایک طرف ڈالے جا رہی تھی۔ ابھی روڑے ہی چننا تھے۔ وہ کام دل لگا کر کرتی تھی۔ کبھی چوہدرانی کو شکایت کا موقع نہ دیا تھا۔ آج بھی وہ پھٹک سے کام میں مصروف تھی۔ ذہن میں سوچیں تھیں' خواب تھے' آرزوئیں تھیں۔ جسم اور ذہن دونوں ہی مصروف تھے اسی لئے اسے پتا ہی نہ چلا کہ شیرا کس وقت وہاں سے کھسک گیا ہے۔

جیراں ادھر ادھر بکھری گندم سمیٹنے لگی تو شیرے کا خیال آیا۔ چاروں طرف دیکھا' مڑی' نظر دوڑائی شیرا نہیں تھا۔ دل دہل ہی تو گیا۔ کسی کمرے سے چوہدرانی کے زور زور سے بولنے کی آوازیں بھی آئیں۔

"ہائے مر گئی۔ ضرور اس نے آج کچھ نقصان کیا ہے۔" جیراں چھاج اور گندم پھینک جلدی سے اٹھ کر اس دالان کی طرف لپکی۔ جدھر سے چوہدرانی کی غصے بھری باتوں کی آواز آ رہی تھی۔ اس کا دل بے اختیار ہو کر دھک دھک کر رہا تھا لیکن چوہدرانی شیرے پر نہیں دنیا پر گرج برس رہی تھی۔ جیراں وہیں زمین پر بیٹھ گئی۔ کمر دیوار کے ساتھ لگا کر آنکھیں بند کر لیں۔ اس نے سکون کا سانس لیا۔

پھر وہ اٹھ کھڑی ہوئی' اندر آئی اور چوہدرانی سے بولی "بی بی جی' میں سمجھی شیرے نے

www.freepdfpost.blogspot.com

کوئی شرارت کی ہے۔"

"وہ تو ادھر نہیں آیا۔" چوہدرانی دینو کو خشمگیں نگاہوں سے دیکھتے ہوئے اس سے بولی "جا دیکھ اسے بھی۔ ہزار دفعہ کہہ چکی ہوں اسے ساتھ نہ لایا کر۔ لاتی ہے تو پاس ہی بٹھایا کر۔"

جیراں فوراً ہی وہاں سے کھسک گئی۔ شیرے کو ساتھ والے دالان میں دیکھا۔ پھر پرلے صحن میں گئی جہاں بچے کھیل رہے تھے۔ شیرا وہاں کہیں بھی نہیں تھا۔

فوراً ہی جیراں کو بیٹھک کا خیال آیا "ضرور ادھر ہی گیا ہو گا" وہ اپنے آپ سے بولی "میرا بھی دماغ الٹ گیا۔ جو اتنی دیر سے یہی سمجھتی رہی کہ میرے پاس ہی بیٹھا ہے۔ کم بخت کسی دن چوہدری سے جوتے کھائے۔ باز نہیں آتا بیٹھک میں جانے سے۔"

وہ تیز تیز قدم اٹھاتی بیٹھک کی طرف لپکی۔ بیٹھک مردانے حصے میں تھی۔ حویلی کے نوکر چاکر چوہدری گھر پر ہو نہ ہو' ادھر ہی رہتے تھے۔ چوہدری کے ملنے والے' کام کاج والے مزارع اور دوسرے لوگ اسی بیٹھک میں آکر بیٹھا کرتے تھے۔

"جیراں لپکی جا رہی تھی کہ فقیر محمد نے پوچھا "کدھر جا رہی ہے؟"

"بب..... بیٹھک....." اس نے بیٹھک کی طرف اشارہ کیا۔ فقیر محمد بولا "چوہدری صاحب نہیں ہیں بیٹھک میں۔"

"لیکن....."

"کوئی بھی نہیں ہے بیٹھک میں کیا لینے آئی ہے؟"

"وہ جی' چوہدرانی جی نے بھیجا ہے۔ وہ کھیس....."

"ہوں' جا' لے جا کھیس چوہدری جی نے بھی آج بدلنے کو کہا تھا۔"

جیراں کی جان میں جان آئی۔ وہ تو شیرے کو دیکھنے آئی تھی۔ اسے یقین تھا کہ وہ بیٹھک ہی میں ہو گا اور چونکہ چوہدری یا کوئی اور بیٹھک میں نہیں تھا۔ اس لئے ضرور چیزیں چھیڑ رہا ہو گا۔

گھبرائی گھبرائی وہ بیٹھک میں داخل ہوئی۔ اس کی پہلی نظر پلنگ پر پڑی۔ دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ ہونے لگی۔ شیرا بڑے مزے سے پلنگ پر ہاتھ

پاؤں پسارے سو رہا تھا۔ جیراں نے گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا۔ پھر لپک کر آئی اور شیرے کو گھسیٹ کر پلنگ سے اٹھایا اور بازوؤں میں لے لیا۔

شیرا گہری اور مزے کی نیند لے رہا تھا۔ جیراں نے اسے سینے سے لگا لیا۔ اس کا ماتھا چوما اور اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

پہلی بار اس کے دل میں شدت سے یہ خواہش مچلی کہ کاش اس کی اتنی بساط ہو کہ وہ اپنے شیرے کے لئے ایسا پلنگ بنوا سکے۔

وہ جلدی سے بچے کو لے کر دوسرے دروازے سے باہر نکل گئی۔ ڈر تھا کوئی نوکر چاکر دیکھ نہ لے اس پلنگ پر تو چوہدری کے بچے بھی نہیں سوتے تھے۔ یہ تو چوہدری جیسے بے تاج بادشاہ کا تخت تھا۔ وہ اس پر جلوہ گر ہوتا تھا۔ اس پر بلا اجازت کوئی دوست بیلی بھی نہ بیٹھ سکتا تھا۔

جیراں دل ہی دل میں شکر ادا کر رہی تھی کہ کسی نے شیرے کو پلنگ پر یوں گہری نیند سوتے نہیں دیکھا تھا۔ ورنہ اس کے ساتھ جیراں کی بھی شامت آ جاتی۔ کچھ عجب نہ تھا کہ اس کا حویلی میں آنا جانا ہی بند کر دیا جاتا۔

اس دن سے جیراں بڑی محتاط ہو گئی تھی۔ اس کی کوشش ہوتی کہ جب وہ حویلی جائے تو شیرے کو گھر پہ ہی چھوڑ جائے بچہ شرارتی تھا۔ کسی کے سپرد کئے بنا چھوڑا بھی نہیں جا سکتا تھا..... اور ایک بار بھابی نے یہ ذمے داری لی لیکن جب شیرے کو پتا چلا کہ ماں اسے چھوڑ کر حویلی گئی ہے' اس نے چیخ چیخ کر آسمان سر پر اٹھا لیا۔ مجبوراً اسے حویلی چھوڑ کر آنا پڑا۔

آج بھی جیراں نہیں چاہتی تھی کہ شیرے کو ساتھ لے جائے۔ چوہدرانی کے مہمان شہر سے آئے تھے اور اسے بلا بھیجا تھا۔ اسی لئے اس نے بھابی سے کہا کہ وہ شیرے کو اس کے پاس چھوڑ کر جا رہی ہے۔ مگر بھابی نے ذمے داری لینے سے صاف انکار کر دیا۔

جیراں کو دل ہی دل میں غصہ بھی بہت آیا لیکن مناسب ہی سمجھا کہ بچے کو ساتھ لے جائے۔ اسے گلی میں بھی تو چھوڑ کر نہ جا سکتی تھی' شرارتی تھا۔ اوٹ پٹانگ کھیل کھیلتا' بچوں سے لڑتا' مارتا اور مار کھاتا تھا۔ درختوں پر بھی چڑھ جاتا' چڑیوں کے بچے گھونسلوں سے نکال لاتا۔ درخت سے گر کر ہڈی پسلی تڑوا سکتا تھا۔ اس لئے جیراں اسے گلی میں کھیلنے کو تو بالکل ہی

www.freepdfpost.blogspot.com

نہ چھوڑ سکتی تھی۔ بادل ناخواستہ ساتھ ہی لے جانا تھا۔

وہ صحن عبور کر کے باہر کے دروازے کی طرف آئی تو شیرا دوڑتا ہوا اندر آیا۔ وہ کیچڑ میں لت پت تھا۔ پاؤں سے ننگا گھٹنوں سے نیچے تک کرتا۔ گنجے سر پر بے شمار دانے۔ جن پر دو ایک کھیاں بھی چپکی تھیں۔ صبح سے منہ دھویا تھا نہ ہاتھ۔ آنکھ کھلتے ہی روٹی کا ٹکڑا چنگیر سے اٹھا کر گلی میں بھاگ گیا تھا۔

جیراں کو بھابی پر غصہ تو تھا ہی اس پر شیرے کی یہ حالت دیکھی تو اسے گردن سے دبوچ کر گھسیٹتے ہوئے صحن میں لگے نل کے نیچے لا پٹخا۔ شیرا چیخ چیخ کر رونے لگا "ماں' شیدے نے مجھے دھکا دیا تھا۔ میں کیچڑ میں گر گیا تھا۔"

"تجھے تو کسی کی آئی آئے۔ مر جائے تو۔ میری جان چھوٹے۔ دکھ اور غصے میں جیراں اسے دھمو کے لگا لگا کر کوسنے لگی۔ وہ اونچی آواز میں بول بک رہی تھی کہ دالان میں بیٹھی بھابی بھی سن سکے لیکن بھابی کو کیا۔ وہ نہ اپنی جگہ سے اٹھی نہ ہی جیراں کو بچے کے دھمو کے لگانے اور کوسنے سے منع کیا۔

جیراں نے اس دن شیرے کو بے جگری سے مارا پیٹا۔ نل تلے ننگا کر کے بٹھاتے اٹھاتے وقت اس کے کندھے توڑ ڈالے۔ وہ رو رو کر بے حال ہو گیا۔

نہلا کر وہ اسے کوٹھڑی میں لے آئی۔ جھلنگا سی چارپائی میں پٹختے ہوئے الگنی پر سے اس کا دھلا ہوا کرتا اور پاجامہ اتار کر اسے پہنایا۔ بچہ ہچکیاں لے رہا تھا۔ کپڑے پہنتے ہوئے بھی ضد کر رہا تھا۔ مار کھا کر ادھ موا سا بھی ہو رہا تھا۔

"شیرے مار ڈالوں گی تجھے" جیراں نے پاجامہ پہناتے ہوئے اس کی ٹانگ مروڑی۔

"ماں....." وہ درد سے بلبلا کر بازو پھیلاتے ہوئے بولا۔ تو جیراں کا دل بھر آیا۔ اس نے بچے کو بازوؤں میں بھر کر سینے سے لگا لیا اور خود زار و قطار رونے لگی۔ اس نے بچے کو جس بے دردی سے مارا پیٹا تھا اپنی ممتا ہی بلبلانے لگی تھی۔ وہ بچے کا ماتھا چومتی جاتی' روتی جاتی اور اسے لپٹائے جاتی۔

شیرا چپ تو ہو گیا لیکن سسکیاں اس کے اندر اب بھی ٹوٹ رہی تھیں۔ جیراں نے اسے جی بھر کر پیار کیا۔ بالوں میں تیل چپڑا آنکھوں میں سرمہ لگایا۔ ماتھا چوم کر بولی "چل

میرے لال"

اس نے شیرے کے پاؤں میں ربڑ کے سلیپر ڈالے اور انگلی پکڑ کر کوٹھڑی سے باہر لے آئی۔ اس نے چادر کے پلو سے اپنی آنکھیں بھی پونچھ لیں۔

وہ شیرے کی انگلی پکڑے پکڑے گلی عبور کر کے کھلے کھیتوں کی طرف آ گئی۔ پگڈنڈی سے ہوتی حویلی کی طرف بڑھنے لگی۔ راستے میں دو ایک گاؤں کی عورتیں ملیں۔ جیراں نے علیک سلیک کے سوا ان سے بھی کوئی بات نہ کی۔ اس کا دل بچے کے لئے اب بھی دکھ رہا تھا۔

حویلی قریب آئی تو اس نے بچے سے کہا "دیکھ شیرے شرارتیں نہیں کرنا۔ ورنہ چوہدرانی سے مار کھائے گا۔ کھال ادھیڑ ڈالتی ہے وہ۔ میرے پاس ہی بیٹھے رہنا۔ ادھر ادھر نہیں بھاگنا اور ہاں چوہدری کی بیٹھک کی طرف بالکل نہیں جانا۔"

"کیوں؟" شیرا معصومیت سے بولا۔

جیراں کو اس کیوں پر غصہ آ گیا۔ اسے کندھے سے جھٹکتے ہوئے بولی "کیا لینے جاتا ہے چوہدری کی بیٹھک میں؟"

"ماں.....وہ پلنگ....."

جیراں نے شیرے کا کام مروڑتے ہوئے کہا "کیا نظر آتا ہے تجھے اس میں؟ پاگل ہی ہو گیا ہے۔"

شیرا کان چھڑاتے ہوئے ماں سے لپٹ کر بولا "وہ پلنگ مجھے بہت اچھا لگتا ہے ماں۔"

"ہائے ربا....." جیراں جیسے عاجز آ کر بولی۔

"ماں" شیرا اسی معصومیت سے بولا۔

"کیا ہے؟" وہ غرائی

"ماں!" شیرا اس کی غراہٹ پر دھیان دئے بغیر اپنی ہی لے میں بولا "مجھے بھی لے دے نا ایسا پلنگ۔"

جیراں کے قدم رک گئے۔ اس نے شیرے کی طرف دیکھا جو آنکھوں میں التجا لئے اسے تک رہا تھا وہ وہیں بیٹھ کر اس کو اپنے سامنے کرتے ہوئے بولی "شیرے تجھے واقعی ویسا پلنگ لا دوں؟"

www.freepdfpost.blogspot.com

"ہاں ماں" وہ اس کے گلے میں بانہیں ڈال کر مچلا۔

"اچھا لادوں گی" وہ اسے پیار کرتے ہوئے اٹھی۔

"کب؟"

"جب تو پڑھے گا لکھے گا' جوان ہو کر پیسے کمائے گا' تب۔"

اس نے ایک گہری سانس کھینچی۔

شیرا ایک دم خوش ہو کر بولا "ماں میں کب پڑھوں لکھوں گا؟"

"تو پڑھے گا.....؟"

"ہاں۔"

"تو پھر اسکول جایا کرنا۔"

"لے جانا مجھے اسکول۔"

"سچ کہتا ہے نا پڑھا کرے گا۔"

"ہاں ماں....."

"تو پھر کل میں تجھے اسکول داخل کروا دوں گی۔ شجو' رحمتے اور سردار کے ساتھ تو بھی جایا کرنا۔

"جاؤں گا۔"

"رونا دھونا نہیں۔"

"نہیں ماں" شیرے نے بے اختیار اپنے دامن سے آنکھیں پونچھ ڈالیں۔ جیراں کو بچے پر بہت پیار آیا..... اس نے جھک کر اس کی پیشانی چوم لی۔ شیرا اس کی ٹانگوں سے لپٹ گیا اور بڑے دلار سے بولا "پھر تو پلنگ لے دے گی نا ماں مجھے؟"

"بالکل۔ وعدہ۔ تم بھی وعدہ کرو پڑھو گے لکھو گے؟"

جیراں نے ہاتھ بڑھایا۔ شیرے نے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ پر زور سے مارا۔ ماں بیٹا دونوں ہنس پڑے۔

حویلی کا صدر دروازہ سامنے آگیا تھا۔ چوہدری کی بیٹھک کا دروازہ ڈیوڑھی ہی میں کھلتا تھا۔ جب جیراں شیرے کو لے کر ادھر سے گزری تو شیرا ماں کا ہاتھ چھڑا کر دروازے کی طرف

لپکا اور دہلیز پر بیٹھ کر سامنے دیوار کے ساتھ بڑے پلنگ کو دیکھنے لگا۔

"شیرے" جیراں نے آواز دی۔

لیکن اس نے جیسے آواز سنی ہی نہیں۔ وہ قدم بڑھا کر ادھر آئی۔ بیٹے کو کندھے سے پکڑ کر اٹھانے کو تھی کہ چوہدری صاحب دروازے سے باہر نکل آئے۔ شیرا وہیں بیٹھنے کو مچلنے لگا تھا۔

"کیا بات ہے جیراں؟" وہ بولا۔

جیراں نے چوہدری کو سلام کرتے ہوئے کہا "گندم پھٹکنے آئی ہوں چوہدری جی' یہ شیرا یہیں رک گیا۔ اسے لے جانے آئی ہوں۔"

"کھیلنے دو اسے' تم جاؤ کام کرو۔"

"جی' یہ شرارتی ہے۔"

"بچہ ہے۔"

پھر وہ شیرے سے بولے "کوئی شرارت نہیں کرنا سمجھے۔"

"میں ادھر ہی بیٹھوں گا..... وہ..... وہ پلنگ دیکھوں گا۔" چوہدری نے بچے کی بات نہ سنی نہ ہی سمجھی' یونہی سر ہلاتے ہوئے صدر دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

اس کے جانے کے بعد جیراں شیرے کو گھسیٹ کر وہاں سے لے آئی۔ جب وہ گندم کے ڈھیر پر بیٹھی چھاج سے دانے پھٹک رہی تھی۔ شیرے کو بار بار کہہ رہی تھی "اس طرح تنگ کرے گا نا تو کبھی پلنگ لے کر نہیں دوں گی۔"

"نہیں تنگ کروں گا ماں۔ پلنگ لے کر دینا مجھے۔" وہ اس دن واقعی سارا وقت ماں کے ساتھ چپکا رہا۔

اگلے دن جیراں اسے اسکول لے گئی۔ گلی ہی میں ماسٹر اللہ دسایا رہتا تھا۔ شام ہی اس نے شیرے کو داخل کروانے کی بات اس سے کر لی تھی۔

جیراں کو توقع نہیں تھی لیکن شیرے میں حیرت انگیز تبدیلی آگئی تھی۔ وہ بڑے شوق سے اسکول جانے لگا تھا۔ وہ اکثر ماں کو اس کا وعدہ یاد دلاتا "ماں پڑھ لکھ کر نوکری کروں گا تو مجھے پلنگ بنا دے گی نا چوہدری جیسا؟"

www.freepdfpost.blogspot.com

"ضرور بنا دوں گی" جیراں اسے بازوؤں میں بھر کر پیار کرتی۔ پھر کہتی "اس سے بھی خوبصورت پلنگ بنواؤں گی اپنے لال کے لئے۔"

"نہیں ماں" شیرا فوراً کہتا "بالکل ویسا۔ جیسا چوہدری کا ہے۔"

"اچھا بھئی ویسا ہی سہی" جیراں بچے کی لگن سے مرعوب ہو جاتی۔

وقت گزرتا رہا تھا۔ شب و روز کا چکر دنوں کو ہفتوں' ہفتوں کو مہینوں اور مہینوں کو برسوں میں ڈھالتا چلا گیا۔ شیرا بڑا ہو گیا۔ اس نے سات جماعتیں پڑھ لیں۔ جیراں اب بھی گندم پھٹکنے باقاعدگی سے گاؤں کی چوہدرانی کی حویلی جاتی۔ پیسے ملتے' اترنیں ملتیں اور کبھی کبھی چوہدری شیرے کے لئے بھی کچھ پیسے دے دیتا۔ شیرا اب ماں کے ساتھ ضد کر کے نہیں آتا تھا۔ ہاں کبھی کبھی چوہدری کے سلام کو حاضر ہوا کرتا۔ چوہدری اس سے اس کی پڑھائی کا پوچھتا اور وہ جی بھر کے اس کے لال پایوں والے پلنگ کو دیکھا کرتا۔

گاؤں کا اسکول مڈل تک ہی تھا۔

ایک دن چوہدری نے شیرے سے پوچھا "کس جماعت میں ہو؟"

"ساتویں جماعت میں چوہدری جی۔"

"آٹھ جماعتیں پڑھو گے؟"

"جی چوہدری جی۔"

"اس سے آگے؟"

"اسکول میں آٹھ جماعتیں ہی ہیں چوہدری جی۔ آگے پڑھنے کے لئے شہر جانا پڑتا ہے اور ماں کہتی ہے شہر نہیں بھیج سکتی مجھے۔

"پھر کیا کرے گا؟"

"پتا نہیں۔"

"ماں کو بھیجنا میرے پاس' اس سے بات کروں گا میں۔"

دوسرے دن جیراں چوہدری کے پاس آئی۔ چوہدری نے شیرے کی پڑھائی کے متعلق پوچھا۔

"بس جی آٹھ جماعتیں ہی پڑھ لے تو کافی ہیں۔ کسی کام دام پر لگ ہی جائے گا۔

پڑھائی میں تو اچھا ہے پر شہر کیسے بھیجو۔"

"ہوں" چوہدری نے سر ہلایا "یوں کرو۔"

"جی....." "اسے یہاں بھیج دیا کرو۔ میرے پاس....."

"جی.....؟"

"ہاں' چھوٹے موٹے کام بھی کیا کرے گا اور پڑھا بھی کرے گا..... تیرا بوجھ بھی ہلکا ہو جائے گا' کچھ پیسے دے دیا کروں گا اسے۔"

"آپ کا چاکر ہے چوہدری جی۔"

"یہاں رہا تو ٹھیک رہے گا۔"

"جی' چوہدری جی۔"

"زنان خانے میں بھی آ جا سکتا ہے' مجھے اتنے ہی بڑے لڑکے کی تلاش تھی۔ کل اسے دیکھا تو خیال آیا اسے ہی کیوں نہ یہاں رکھ لوں۔ تجھے کوئی اعتراض تو نہیں؟"

نہ چوہدری جی۔ میرا بچہ آپ کی سرپرستی میں رہے گا' مجھے اور کیا چاہئے۔ ذرا شام کو جلدی گھر آ جایا کرے۔"

"ہاں ہاں۔"

"مہربانی سرکار۔"

"تیرے بھلے ہی کے لئے کہہ رہا ہوں۔ جوان ہو جائے گا تو کہیں نوکر بھی کرا دوں گا۔ تو نے ساری عمر محنت کی ہے۔ کچھ آرام کے دن تو بھی دیکھ لے۔"

جیراں چوہدری جی کو دامن پھیلا پھیلا کر دعائیں دینے لگی۔ گھر جا کر جب اس نے شیرے کو بتایا تو وہ خوشی سے کھل اٹھا۔ س کی تو دلی مراد بھر آئی تھی۔ جھٹ سے بولا "میں چوہدری کی بیٹھک میں رہا کروں گا۔"

"ہاں۔"

"پلنگ والی بیٹھک میں۔ ماں تو نہیں جانتی مجھے کتنی خوشی ہو رہی ہے۔"

"پلنگ کے لئے تو پاگل تو نہیں ہو گیا رے۔"

"وعدہ یاد ہے ناں؟"

www.freepdfpost.blogspot.com

"تجھے بھی یاد ہے نا؟"

"بالکل۔ دیکھو تو پڑھ رہا ہوں۔ چند سالوں میں کمانے بھی لگوں گا۔ پھر تو مجھے ویسا ہی پلنگ بنا دے گی نا؟"

"ہاں۔"

"تب تک چوہدری کے پلنگ سے ہی کام چلے گا۔"

"اے شیرے؟"

"ہاں' ماں۔"

"دیکھ۔ بیٹھک میں رہنے کا مطلب یہ نہیں کہ تو چوہدری کے پلنگ کو استعمال کرنے لگے۔"

"توبہ۔ چوہدری کے پلنگ کو کون استعمال کر سکتا ہے ماں' میں بھلا جانتا نہیں۔"

"پھر کیا کہہ رہا تھا؟"

"ماں بیٹھک میں رہنے سے پلنگ دیکھا تو کروں گا نا۔"

"ہائے شیرے۔ تجھے اتنا ہی اچھا لگتا ہے وہ پلنگ!"

"ہاں ماں۔"

جیراں اندر ہی اندر دکھی ہو گئی۔ کاش اتنی استطاعت ہوتی کہ وہ اپنے بچے کی یہ خواہش ابھی پوری کر سکتی۔

شیرا چوہدری کی بیٹھک میں رہنے لگا۔ اسکول سے سیدھا ادھر ہی آ جاتا۔ حویلی کے دوسرے نوکروں کے ساتھ وہیں کھانا کھاتا پھر بیٹھک میں آ جاتا۔ کبھی چوہدری کے حقے کو تازہ کر دیتا کبھی چلم بھر لاتا۔ مٹھی چاپی بھی کرنے لگا اور زنان خانے میں چوہدری کے کاموں کے لئے آنے جانے بھی لگا۔ وہ بہت خوش تھا۔ خوشی کی لہریں اس کے اندر اٹھنے لگی تھیں۔

آٹھویں کے بعد اس نے پڑھائی چھوڑ دی اور چوہدری کی خدمت پر مامور ہو گیا۔

اچھا کھانے کو ملنے لگا' سر سے پڑھائی کا بوجھ اتر گیا اور پلنگ کی قربت بھی میسر آئی تو شیرے نے دونوں میں قد کاٹھ نکالا۔ رنگت بھی صاف ہو گئی۔ جسم بھی بھر گیا۔ چند برسوں میں وہ گھبرو جوان ہو گیا۔ جیراں بیٹے کو دیکھ دیکھ کر پھولے نہ سماتی۔

جیراں کی عمر اب ڈھلنے لگی تھی۔ بال کھچڑی ہو گئے تھے وہی ٹوٹے کواڑوں والی کوٹھڑی تھی اور وہی بے سروسامانی۔ اسی طرح باقاعدگی سے گندم پھٹکنے حویلی جاتی تھی اور وہی تھوڑے سے پیسے چوہدرانی اور اس کے بیٹے کی اترنیں ملتیں۔

چوہدری شیرے کو بھی کبھی کبھی پیسے دے دیتا جس سے بمشکل گزر بسر ہوتی۔ حالات جیسے تھے ویسے ہی رہے۔

"ماں....." ایک دن شیرے نے ماں سے کہا۔

"کیا ہے بیٹے؟"

"ماں۔ میں سوچتا ہوں....."

"کیا؟"

"کچھ کام دھندا کروں۔ یوں چوہدری کی بیٹھک میں کامے کی حیثیت میں پڑے رہنے سے تو ہمارا کچھ نہیں بنے گا۔"

"کیا بنانا ہے تجھے؟"

"ماں۔ اس کال کوٹھڑی میں پڑے پڑے بچپن بیتا جوانی آئی۔ کوئی ڈھنگ کی چیز نہیں ہمارے پاس' کوٹھڑی کی مرمت تک نہیں کروا سکتے۔ دروازہ اب تو بالکل ہی گرنے کو ہے۔"

"تو.....؟"

میں کوئی کام کروں۔ پیسے کما کر لاؤں کچھ تو حالت سدھرے گی ہماری۔"

"لیکن چوہدری جی؟"

"ان سے پوچھ لوں گا۔"

"جو وہ نہ مانے تو؟ بیٹا ان کے بڑے احسان ہیں ہم....."

"میں کب بھلا رہا ہوں ان کے احسانوں کو۔ لیکن یوں بھی تو نہیں چلے گا ماں۔ میں کچھ کرنا چاہتا ہوں۔ کچھ بننا چاہتا ہوں۔ سارا دن مٹھی چاپی کرنا اور چلمیں بھرنا' یہ بھی کوئی کام ہیں۔"

"اچھا اچھا۔ کبھی موقع پا کر چوہدری جی سے بات کرنا۔ سیلن دیکھنا۔ چوہدری جی غصے میں نہ آ جائیں۔ بھولنا نہیں کہ وہ ہمارے محسن ہیں۔"

www.freepdfpost.blogspot.com

شیرے نے سرہلا کر ماں کو یقین دلایا کہ وہ سمجھدار ہے۔ بات موقع مناسب دیکھ کر ہی کرے گا۔

لیکن اس کو بات کرنے کی ضرورت ہی پیش نہ آئی۔ انہی دنوں چوہدری کے عزیز دوست کرنل فتح محمد حویلی آئے۔ وہ جوانوں کی بھرتی کے سلسلے میں چوہدری سے بات کرنے آئے تھے۔ شیرے کو دیکھا تو چوہدری سے بولے "کیا گبھرو جوان ہے' اسے بھرتی کیوں نہیں کروا دیتے۔ وطن کی "سرحدوں کو ایسے کڑیل جوانوں ہی کی تو ضرورت ہے۔"

پھر انہوں نے شیرے سے کہا "اے لڑکے فوج میں بھرتی ہو گا؟ وردی' تنخواہ' کھانا پینا رہنے کی جگہ سب کچھ ملے گا۔"

شیرے نے چوہدری صاحب کی طرف دیکھا اور مودبانہ بولا "چوہدری صاحب اجازت دیں تو ضرور بھرتی ہوں گا۔"

"میں نے کیا اجازت دینی ہے شیرے" چوہدری صاحب مسکرائے "اپنی ماں سے پوچھو۔ وہ راضی ہو تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔"

"وہ راضی ہی ہو گی چوہدری صاحب" شیرا خوشی سے بولا۔ "ایک ہی بیٹا ہے تو اس کا اور جن مصیبتوں اور محنتوں سے اس نے تجھے پالا ہے ہم جانتے ہیں۔"

"چوہدری" کرنل صاحب بولے "ایک ہو یا دو۔ اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ موت زندگی اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ ہم فوجی اس بات پر پورا یقین رکھتے ہیں۔ شیرا فوج کے لئے موزوں ہے۔ ہمیں ایسے گبھرو شیروں کی ضرورت ہے جو دفاع وطن کے لئے سیسہ پلائی دیوار بن سکتے ہوں۔ اس کی زندگی بن جائے گی۔ یہاں تمہاری بیٹھک میں پڑا پڑا خود کو ضائع کر رہا ہے۔"

کرنل کے قائل کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ شیرے کی تو دلی مراد بر آئی تھی۔ خاکی وردی نے اسے مرعوب کیا تھا۔ پھر تنخواہ ملنے کی بھی امید تھی۔ یہی تو وہ چاہتا تھا۔ پیسے کمائے' ماں کو دے تاکہ گھر کی حالت سدھر سکے۔ کمائی کرنے کی اسے لگن تھی۔ خاص کر جب ماموں کی بیٹی حمیداں میں اس کی دلچسپی آپوں آپ پیدا ہو گئی تھی۔ وہ اپنا گھر بنانے سنوارنے کے متعلق سنجیدگی سے سوچنے لگا تھا۔

کرنل صاحب نے جیراں کو بھی قائل کر لیا۔ شیرے کے علاوہ گاؤں کے پانچ لڑکے اور بھی تیار کئے۔ وہ سب کو اپنی جیپ میں بٹھا کر شہر لے گئے۔ یہاں انہیں رنگروٹنگ آفیسر کے حوالے کر دیا۔ ان کے ٹیسٹ ہوئے' میڈیکل چیپ اپ ہوا۔ دوسری کارروائیاں ہوئیں پھر انہیں ابتدائی ٹریننگ سینٹرز بھیج دیا گیا۔

PdfStuff.blogspot.com

www.freepdfpost.blogspot.com

کئی ماہ بعد شیرا فوجی جیپ میں اپنے حوالدار میجر اور دو سرے دو ساتھیوں کے ساتھ سرحدی چوکی کی طرف جاتے ہوئے تھوڑی دیر کے لئے ماں سے ملنے آیا تو لوگ اسے دیکھ کر حیران رہ گئے۔ خاکی وردی اس کے گرائنڈیل جسم پر خوب سجی تھی۔ کتنا صحت مند ہو گیا تھا وہ۔ ترچھی ٹوپی اس کے ماتھے پر جھکی ہوئی تھی۔

جیپ کو گاؤں کے لوگوں نے گھیر لیا۔ شیرے سے ہاتھ ملانے اور اس سے گلے ملنے کو ہر کوئی بیتاب تھا۔ وہ ہنستا مسکراتا سب سے ملتا ملاتا گھر آیا۔ تو ماں اسے تکتی کی تکتی رہ گئی۔ حمیداں کی آنکھوں میں ستارے چمک اٹھے۔

"ماں' پیار نہیں کرو گی مجھے" شیرے نے ہاتھ پھیلائے تو جیراں خوشگوار حیرتی سکتے سے نکل کر اس سے لپٹ گئی "میرا فوجی بیٹا۔ میرا لال۔ میرا پتر۔"

جیراں کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے۔ شیرے نے اس کی پشت تھپکی۔ پھر حمیداں کا حال پوچھتے ہوئے آہستگی سے بولا "میری ماں کی دیکھ بھال کرتی رہنا۔ اسے محسوس نہ ہو کہ میں اس کے پاس نہیں۔"

"حمیداں نے چمکتی آنکھیں جھکا کر دوپٹے کا پلو مروڑتے ہوئے کہا "تیرے کہنے کی ضرورت نہیں۔ یہ میرا فرض ہے شیرے۔"

شیرا تھوڑی دیر وہاں رکا۔ حمیداں کی ماں دودھ بھرا گلاس لے آئی۔ شیرے کے ساتھیوں کو بھی دودھ بھجوایا۔ شیرے نے اپنی نوکری کے متعلق مامے فضل کو مختصراً بتایا۔ ہر ماہ تنخواہ باقاعدگی سے ماں کو ملا کرے گی۔ اس کی تفصیلات بھی سمجھائیں۔ ضروری کاغذات بھی اس کے حوالے کئے۔ اپنے ہیڈ کوارٹر میں اس نے اپنا سرپرست ماموں ہی کو مقرر کیا تھا۔

ان دنوں سرحدی چوکیوں پر دباؤ کے تحت فوجی وہاں بھیجے جا رہے تھے۔ وہ بھی ایک سرحد چوکی پر جا رہا تھا۔ یہ بات اس نے صرف ماموں کو بتائی تھی۔

رخصت ہونے سے پہلے اس نے ماں کو بازوؤں میں سمیٹ کر شوخی سے کہا "ماں اپنا وعدہ میں نے پورا کر دیا ہے' کمانے لگا ہوں۔ اب تو بھی اپنا وعدہ پورا کرے گی نا"

"میں تو کئی وعدے پورے کروں گی" اس نے پاس کھڑی حمیداں کو مسکرا کر دیکھا۔

"ہوں ہوں" شیرا شوخی سے بولا "میرے ساتھ کیا ہوا وعدہ ماں۔ بہت پرانا وعدہ۔"

"لال پایوں والے پلنگ کا" ممانی جس کر بولی۔

"ہاں....."

"دیکھ تو کتنا خوبصورت پلنگ بناتی ہوں تیرے لئے۔"

"آں ہاں۔ زیادہ خوبصورت نہ کہ۔ بالکل ویسا۔ ویسا ماں۔" اس نے ماں کو پیار کرتے ہوئے کہا۔

"اچھا' میرے لال بالکل ویسا ہی بناؤں گی۔"

شیرے نے جیب سے کچھ پیسے نکال کر ماں کو دیئے۔ پھر بولا "ایسی جلدی بھی نہیں' پہلے تم اپنا جوڑا بنوانا۔ کو ٹھڑی ٹھیک کروانا۔ کھانے پینے کی چیزیں لینا۔ اس کے بعد پلنگ۔"

جیراں نے اس کی پیشانی چوم لی۔

شیرا چلا گیا۔ ماں نے دلی دعاؤں کے سائے میں اسے رخصت کیا۔ چھٹی باقاعدگی سے لکھنے اور چھٹی جلدی جلدی لے کر آنے کی تاکید کی۔ وہ ہنستا مسکراتا چلا گیا۔

دن دھیرے دھیرے گزرنے لگے۔ کئی دن جیراں کا دل اداس رہا۔ رات دن شیرے کی خیر مانگتی۔ حمیداں اکثر اس کا جی بہلاتی چھوٹے موٹے کام کر دیتی۔ جیراں کو اس کا بڑا سہارا تھا۔ شیرے کے چٹھیاں بھی حمیداں ہی اسے پڑھ کر سنایا کرتی اور اسی سے جیراں جواب لکھوایا کرتی۔

جیراں نہ تو اپنے لئے نئے کپڑے خرید کر لائی نہ ہی کوٹھڑی کی مرمت شروع کی۔ سب سے پہلے اس نے شیرے کی فرمائش پوری کرنے کا سوچا۔

وہ خوب اچھی روئی خرید لائی' چرخہ نکالا اور روئی کی پونیاں بنا بنا کر ٹوکرا بھر لیا۔ پوہ ماہ

www.freepdfpost.blogspot.com

کی لمبی اور اندھیری راتوں میں دیر تک اس کے چرخے کی گھوں گھوں سنائی دیتے لگی۔ اس گھوں گھوں میں درد بھرے جدائی کے گیتوں کی لے بھی شامل ہونے لگی۔ جیراں پلنگ کے لئے سُتلی بنائے کے لئے روئی کات رہی تھی۔ کھیس بھی بنوانا تھا۔ بیٹے کی لگن اور شوق کو دیکھتے ہوئے وہ ایک ایک تار میں اپنی محنت کا رنگ گھول رہی تھی۔

کئی ماہ جیراں اپنے کام میں جتی رہی۔ شیرے کی چٹھیاں آتی رہیں۔ دوبار وہ خود بھی آیا۔ اس کا روپ نکھار دیکھ کر کبھی کبھار تو جیراں کا من ڈر ہی جاتا۔ وہ اس کی حاضری اور غیر حاضری میں اس کی نذریں اتارتی۔

جیراں نے سوت کات لیا۔ تو چوکور خانوں والا کھیس بننے کے لئے گاؤں کے جولاہے کو دے آئی۔ اس نے ایک ایک خانے کے متعلق اسے سمجھایا۔ اتنے خانے ہوں اس میں ایسی ڈلی ہو اس میں۔ ایسی لکیریں آئیں کنارے اس طرح کے ہوں۔ وہ ہر روز جا کر اڈے پر چڑھا کھیس دیکھتی اور اپنے سامنے بنواتی۔

باقی سوت اس نے سُتلی بنوانے کے لئے دے دیا۔ پھر اس نے پلنگ کے پائے لانے کے لئے روز ہی شہر جانا شروع کیا۔ چوہدری کا پلنگ جانے کتنے سال پہلے کا بنا ہوا تھا۔ وقت کے ساتھ ڈیزائن اور موٹائی بدل گئی تھی۔ لیکن جیراں نے تو ایسے ہی پائے لانے تھے جیسے چوہدری کے پلنگ کے تھے۔

"ایسے پائے تو ملتان سے ملیں گے مائی" ایک دکان دار نے اسے بتایا۔

"تم منگوا کر دے سکتے ہو؟" اس نے پوچھا۔

"نہیں بی بی۔ ہم منگوالیں وہ تمہاری مرضی کے مطابق نہ ہوں تو؟ خود ہی چلی جاؤ۔ وہاں تمہیں مل جائیں گے۔"

اور جس دن اسے پائے لینے ملتان جانا تھا اسی دن شیرا آگیا۔ وہ بڑی عجلت میں تھا۔ وہ ماں سے ملنے اور اسے خبر دینے آیا تھا کہ اس کی رجمنٹ مشرقی پاکستان جا رہی ہے۔ ان دنوں سرحدوں پر کشیدگی بڑھ گئی تھی۔ دشمن کی افواج مشرقی اور مغربی پاکستان کی سرحدوں پر جمع ہو رہی تھیں۔ جنگ چھڑنے کی باتیں ہو رہی تھیں۔ حالات مخدوش تھے۔ شیرا پریشان بھی تھا کہ ماں نہ جانے اس کے جانے سے کیا اثر لے لیکن وہ حیران رہ گیا جب ماں نے اسے تسلی دلاسا

دے کر رخصت کیا "تجھے رب اپنی پناہ میں رکھے گا۔ تیرا بال بھی بیکا نہیں ہو گا۔ تو غازی بن کر آئے گا۔ میں تیرے انتظار میں زندہ رہوں گی شیرے۔ تیرا پلنگ تیار کروں گی۔ تو واپس آئے گا نا تو تیرا پلنگ بالکل تیار ہو گا۔"

جیراں دعائیں دیتے ہوئے باتیں کئے جا رہی تھی۔ سب اسے تک رہے تھے۔ لگتا تھا۔ صدمے سے دماغ پر اثر ہو گیا ہے جو یوں بولے جا رہی ہے۔ شیرے نے ڈبڈباتی آنکھوں اور گلوگیر آواز میں سب کو خدا حافظ کہا۔ حمیداں سے پھر وہی بات کہی جو ہر بار کہتا تھا "میری ماں کا خیال رکھنا حمیداں۔ اکیلی ہے....."

وہ چلا گیا۔ تو حمیداں بمشکل آنسو ضبط کئے ہوئے تھی۔ جیراں کے گلے لگ کر بے اختیار رونے لگی۔

"اے ہے" جیراں نے اسے جھٹکا دیا "خیری صلا۔ رو کیوں رہی ہے۔ اللہ کا نام لے۔ یہ بدشگونی ہے پونچھ لے آنسو۔ شیرا میرا بیٹا ہے۔ اسے کچھ نہیں ہو گا۔ وہ خیریت سے لوٹ آئے گا۔ مت رو۔ میں ناراض ہو جاؤں گی تم سے۔ شیرا اکیلا تو نہیں گیا اور بھی ماؤں کے لال گئے ہیں۔ آجائیں گے سب زندہ سلامت آجائیں گے۔"

ایک مہینہ گزر گیا۔

شیرے نے ڈھاکہ پہنچ کر خط لکھا۔ خیر خبر ملی تو جیراں نے حمیداں کے سر پر ہولے سے چپت لگا کر کہا "ایسے ہی رو رہی تھی تو' دیکھا نا خیر خیریت سے پہنچ گیا وہاں۔ میرا شیرا۔ اس کا رب راکھا ہے۔ فکر نہ کر۔ آجائے گا خیر سے۔ سہرا باندھنا ہے میں نے اس کے سر اور پھر یہ پلنگ بھی تو اس کی بچپن کی خواہش ہے۔ کہاں جا سکتا ہے بالکل فکر نہ کر۔ وہ خیر سے واپس آئے گا۔"

جیراں ملتان جانے کو تیار ہو گئی۔ خود تو کبھی ادھر کا سفر نہیں کیا تھا۔ گاؤں کے ایک بھائی بندے کو ساتھ لے کر چل پڑی۔

اسے مطلوبہ پائے جنگل خوار ہو کر آخر مل ہی گئے۔ "بھائی دینو! یہ ہیں نا چوہدری کے پلنگ ایسے؟"

"بالکل ویسے ہی" دینو نے کہا۔

www.freepdfpost.blogspot.com

"یہی تو چاہیں تھے۔"

"اچھا ہوا مل گئے۔ اب جلدی سے گاؤں واپس چلیں، حالات اچھے نہیں۔ لوگ کہہ رہے ہیں کسی وقت بھی جنگ چھڑ سکتی ہے۔"

"تو کیا ہوا جنگ چھڑے گی تو دشمن کو منہ کی کھانی پڑے گی۔ میرے شیرے اسے جیالوں کے ہوتے ہوئے دشمن ہمارا بگاڑ بھی کیا سکتا ہے۔"

جیراں جب بھی ایسی باتیں کرتی سننے والے کو گمان ہوتا کہ وہ بیٹے سے جدا ہو کر خوشی اور غم کا احساس ہی کھو بیٹی ہے۔

لیکن ایسا نہیں تھا۔ اس کی مامتا مطمئن تھی۔ اسے ایمان کی حد تک یقین تھا کہ شیرے کو کچھ نہیں ہو گا۔ وہ ملتان سے واپس آئی۔ اگلے دن [illegible] سے سودا لینے جانا تھا۔ لیکن صبح ہی صبح دشمن نے چوروں کی طرح پاکستان پر حملہ کر دیا۔ ہر طرف شور مچ گیا۔ پوری قوم کمربستہ ہو گئی۔ جوش و جذبے سے سرشار قوم دشمن کو دندان شکن جواب دینے کے لئے اپنی فوج کی پشت پر سینہ سپر ہو گئی۔

ایسے میں حمیداں کا دل ڈوب گیا۔ وہ جیراں سے چھپ چھپ کر روتی..... گلی محلے کے لوگ جیراں کے پاس آئے۔ اسے تسلی دلاسا دینے لگے۔ جیراں ان کی باتوں پر ہنس پڑتی۔ بڑے سکون سے کہتی "میرا شیرا محفوظ ہے۔ اسے کچھ نہیں ہو گا۔ وہ غازی بن کر آئے گا۔ وہ بہادری سے لڑے گا۔ واپس آئے گا تو سرکار سے بڑا انعام پائے گا۔"

جیراں تو اس دن بھی نہیں ڈولی جب ایسٹ پاکستان میں لاکھوں فوجی جنگی قیدی بنا لئے گئے۔ افراتفری میں معلوم نہ ہو سکا کہ کتنے فوجیوں نے جام شہادت نوش کیا، کتنے لاپتا ہوئے اور کتنے جنگی قیدی بن کر دشمن کے عقوبت خانوں میں پہنچ گئے۔

جیراں کا بھائی از خود ہی شیرے کے متعلق پتا کرنے کی کوشش میں لگا رہا۔ جی ایچ کیو گیا۔ جہاں سے اس کی اطلاع ملنے کا امکان تھا۔ پہنچا لیکن کچھ پتا نہ چل سکا۔ وہ زندہ ہے شہید ہو گیا۔

بہت مایوس ہو کر لوٹا، آتے ہی جیراں کے گلے میں بانہیں ڈال کر دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔

"بدبختے۔ تیری ساری عمر کی پونجی لٹ گئی۔ میری بہنا۔ ہم برباد ہو گئے۔"

سب لوگ رونے لگے۔ حمیداں تو چارپائی پر اوندھی پڑ کر چیخنے لگی۔

جیراں حیران و ششدر سب کو تکتے ہوئے بولی "کیوں۔ کیا ہوا؟" "کیوں سب پاگل ہو رہے ہو۔ شیرے کو کچھ نہیں ہوا وہ بالکل ٹھیک ہے۔ دیکھتے نہیں ہو ابھی تو پلنگ بھی مکمل نہیں ہوا۔ اسے کچھ کیسے ہو سکتا ہے۔ تم سب بزدل ہو۔ جھوٹے ہو۔ میرے شیرے کو کچھ نہیں ہوا۔ وہ مجھے اکیلا چھوڑ کر نہیں جا سکتا۔ اسے کچھ نہیں ہوا۔ مت رو۔ بدشگونی نہ کرو۔ چپ ہو جاؤ۔ نہیں چپ ہوتے تو اٹھ جاؤ میرے پاس سے۔ میں کہتی ہوں چلے جاؤ یہاں سے۔ بڑے ہمدرد بنے پھرتے ہیں۔ محبت جتا رہے ہیں۔ تم لوگوں نے ایسی باتیں سوچی بھی کیونکر۔ بھیا فضلے تم نے ہی یہ نحوست پھیلائی ہے۔ میرے بھلے چنگے بیٹے کو رونے بیٹھ گئے۔"

جیراں کا چیخ چیخ کر گلا بیٹھ گیا۔ بھابی اٹھ کر آئی۔ اسے گلے لگا کر بولی "جیراں، ہم کوئی تیرے دشمن ہیں۔ ہزاروں جوان لڑائی میں کام آئے ایک ہمارا شیرا بھی....." وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تو جیراں نے اسے پرے دھکیل کر غصے سے کہا "شیرا اللہ کے فضل سے زندہ سلامت ہے۔ تم لوگ جھوٹے ہو۔ جھوٹے ہو۔"

لوگ جیراں کو دیکھ دیکھ کر سسکیاں بھرنے لگے۔ اس کا غیر متزلزل یقین ہی لوگوں کو آنسو بہانے پر مجبور کر رہا تھا۔ دکھیاری ماں سے سب کو ہمدردی تھی لیکن وہ ماں جس کی ممتا اسے یقین دلا رہی تھی جس کا دل کہہ رہا تھا کہ تیرا شیرا صحیح سلامت ہے، جس کے ذہن پر بیٹے کی موت کا نقش بن ہی نہ رہا تھا اپنی دھن میں لوگوں کو رونے دھونے سے منع کر رہی تھی۔

ممتا کا سچ جھوٹا نہیں تھا۔

کئی ماہ گزرنے کے بعد ہیڈ کوارٹر سے اطلاع ملی کہ شیرا زندہ ہے اور دشمن کی قید میں ہے۔ جیراں نے یہ خبر ایسے سنی جیسے وہ پہلے سے جانتی ہو۔ گاؤں میں بڑے دنوں اس کی ممتا کے تیقن کے چرچے رہے۔

جیراں پھر سکون و دلجمعی سے اپنے کام میں لگ گئی۔

جب دونوں ملکوں میں حالات پرسکون ہوئے اور ڈاک کا نظام ٹھیک ہوا۔ جنگی قیدیوں کو اپنے گھروں میں خط لکھنے کی اجازت ملی تو شیرے کا خط بھی آ گیا۔

www.freepdfpost.blogspot.com

جیراں یہ خط لئے لئے گاؤں بھر میں پھری "دیکھ لیا' میرے بیٹے کا خط ہے۔ وہ زندہ ہے۔ جب قیدی چھٹیں گے تو وہ بھی آجائے گا۔"

لوگ خوش تھے۔ جیراں خوش تھی۔

ایک دن وہ سویرے سویرے اپنے بھائی کے والان کی طرف لپکی "بھا..... بھابی۔"

"کیا ہوا جیراں؟" بھابی دروازہ کھولتے ہوئے بولی۔ جیراں دہلیز پر ہی بیٹھ گئی۔ کلیجا ہاتھوں میں تھام لیا۔

"کیا ہوا جیراں؟" بھائی فضل بھی اٹھ آیا۔

"مجھے مجھے لگتا ہے شیرا آگیا ہے۔"

فضلے نے بہن کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا "آ بھی جائے گا۔ جب سب آئیں گے۔"

"نہیں میرا دل کہہ رہا ہے وہ آگیا ہے۔ پر بھا....."

"کیوں جیراں؟"

"پتا نہیں کیا ہو رہا ہے مجھے۔"

"وہم میں پڑی ہے۔ شیرا جنگی قیدی ہے اور جب سب قیدی چھوٹیں گے تو وہ بھی آئے گا۔ یہ حکومتوں کے معاملے ہیں پگلی۔"

"نہیں، وہ آگیا ہے۔"

فضلے نے پھر اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور بولا۔ "اچھا دیکھا ہے کوئی۔"

"نہیں بھیا" وہ سر ہلاتے ہوئے بولی "پتا نہیں۔ کیسے میرا دل کہہ رہا ہے' وہ آگیا ہے۔"

"فضلے نے جیراں کی ذہنی حالت مخدوش سمجھتے ہوئے کہا "اچھا آگیا ہے تو گھر بھی آ جائے گا۔ اس بات کی۔"

"پتا نہیں" وہ ہاتھ ہلاتے ہوئے بولی "یہاں میرے اندر کچھ ہو رہا ہے۔"

"خوشی سے پاگل ہو رہی ہے شاید۔"

"ہاں شاید۔"

وہ اٹھ کر اپنی کوٹھڑی کی طرف چل دی۔

فضل اور اس کی بیوی ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ "اللہ کرے شیرا خیر سے آ جائے ورنہ جیراں تو..... آدھی پاگل ہو چکی ہے....." فضلے نے گہری سانس چھوڑی "پتا نہیں خواب دیکھا ہے کوئی یا یونہی وسوسے سے گھبرا کر آگئی۔"

"بڑی پریشان ہو رہی ہے۔"

"حالانکہ خوش نظر آنا چاہئے اسے۔ کہتی جو ہے کہ شیرا آگیا ہے۔"

"ایسے ہی۔ آئے گا نصیبوں سے۔"

"ہاں۔"

"دونوں باتیں کرتے واپس اپنی چارپائیوں پر آبیٹھے۔

جیراں کوٹھڑی میں آکر لیٹی نہیں۔ اس نے پلنگ بچھا لیا۔ جسے کئی دنوں سے وہ تلی سے بن رہی تھی۔ اس کے ہاتھ تیزی سے کام کرنے لگے۔ اور وہ نامکمل پلنگ کو مکمل کرنے لگی۔ اسے بڑی جلدی پڑی تھی۔ وہ اپنے سے کہہ رہی تھی "میں بھی کتنی پاگل ہوں۔ ست پڑ گئی تھی۔ اب تک پلنگ بنا لینا چاہئے تھا۔ کیا کہے گا شیرا۔ کیسی ماں ہے۔ ایک فرمائش بھی پوری نہ کر سکی۔ کمائی تو اس کی تھی میں نے ہی دیر کر دی پر خیر اس کے آنے تک بنا لوں گی۔"

اس نے شام تک پلنگ مکمل کر لیا۔ اب ادوائن بُننی اور ڈالنی تھی۔ وہ رات کو ادوائن بُنتی رہی۔ صبح تک اس نے یہ کام ختم کرنا تھا۔ رات دو ایک بار حمیداں نے آکر اسے سو جانے کے لئے بھی کہا لیکن اس نے کمر سیدھی تک نہیں کی۔ پو پھٹے ادوائن پلنگ میں ڈال کر اس نے کام مکمل کر لیا تھا۔ پھر اس نے جلدی جلدی گوبر ملی مٹی سے کوٹھڑی اور اس کے باہر کا چھپر تلے کا حصہ لیپا پوتا' صفائی کی اور پلنگ کو کوٹھڑی کے دروازے کے ایک طرف چھپر تلے بچھا دیا۔

اندر سے وہ چوکور خانوں والا کھیس اور ریشمی کڑھائی والا تکیہ بھی نکال لائی۔ پلنگ پر کھیس بچھا کر تکیہ رکھ رہی تھی کہ حمیداں ادھر آئی۔ پلنگ اور کھیس کو دیکھ کر حیرانی سے بولی "چھوپی۔ یہ پلنگ کیوں بچھایا ہے؟ شیرے کے آنے پر بچھاتیں نا۔"

"شیرا آرہا ہے۔" جیراں ناقدانہ نظروں سے دیکھتے ہوئے بڑبڑائی۔ حمیداں نے حیران

www.freepdfpost.blogspot.com

حیران نظروں سے اسے دیکھا۔ دل دکھ گیا کہ پھوپی کا دماغ واقع چل گیا ہے۔

"دیکھ حمیداں" جیراں بولی "سب ٹھیک ہے نا۔ یہ دونوں یہ پلنگ اور کھیس چوہدری جیسا ہی ہے نا؟"

"ہاں ہے تو۔ پر یہ نیا ہے وہ پرانا۔"

"یہ تو ہے۔"

"پھوپی۔"

"ہاں۔"

"تجھے کس نے کہا ہے کہ شیرا آرہا ہے؟"

جیراں نے ایک ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ جو حمیداں کو قہقہہ کم اور چیخ زیادہ لگی۔ آنسوؤں کی پھوار قہقہے کو نم کر گئی۔

"مجھے کون بتائے گا کڑیے۔" وہ بولی پھر دل پر انگلی رکھ کر کہنے لگی "یہ اندر والا ہی بتا رہا ہے کہ شیرا آرہا ہے۔ کل میں نے خود شیرے کی آواز سنی۔ ماں میں آرہا ہوں۔"

"پھوپی....." حمیداں رو دینے کو تھی۔

"کیا ہے؟"

"تیرا دل کہہ رہا ہے کہ شیرا آرہا ہے؟"

"ہاں۔"

"تو پھر خوش نظر کیوں نہیں آرہی۔ جھلی جھلی کیوں لگ رہی ہے۔ ہنستی ہے تو لگتا ہے چیخیں مار رہی ہے۔ بولتی ہے تو لگتا ہے رو رہی ہے۔ سچ بتا پھوپی یہ کیا ہے۔ کیا ہے سب؟"

جیراں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا اور چاروں طرف گھوم پھر کر پلنگ کو دیکھنے لگی اور پھر اپنی کارکردگی سے مطمئن ہو کر بیرونی دروازے کی دہلیز پر آبیٹھی۔ نگاہیں اس سمت گاڑ دیں جس سمت سے شیرے نے آنا تھا۔

اس دن شیرا واقعی آگیا۔

دن ڈھل رہا تھا۔ جب دو فوجی جیپوں میں افسر اور حوالدار' صوبیدار سپاہی گاؤں میں داخل ہوئے۔ جیپوں کے پیچھے فوجی ایمبولینس تھی۔ جس میں اسٹریچر پر شیرے کی لاش تھی اور

چار سپاہی ساتھ ساتھ بیٹھے تھے۔ گاؤں امنڈ آیا تھا۔ لوگ دھاڑیں مار مار کر رو رہے تھے اور ایمبولینس پر گرے پڑتے تھے۔

شیرے نے اپنے دو ساتھیوں سمیت دشمن کی قید سے فرار ہونے کا منصوبہ بنایا تھا۔ وہ تینوں کیمپ سے نکل کر بھاگنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ صعوبتیں سہتے' مصیبتیں اٹھاتے ہوئے موت کا بار بار سامنا کرتے وہ بڑی دقتوں سے سرحد عبور کر کے اپنے عزیز وطن کی مٹی پر سجدہ ریز ہونے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ سرحد عبور کرتے ہی وہ بے تحاشا بھاگنے لگے تھے۔ خوشی سے پاگل ہو رہے تھے۔ وہ لیکن سرحد پر متعین فوجیوں کو وہ مشکوک لگے۔ انہوں نے تینوں کو للکارا۔ یہ ڈر کے مارے رکے نہیں کہ دشمن کے سپاہی تعاقب میں نہ ہوں۔

فوجیوں نے پہلے ہوائی فائر کیے۔ جب بھی یہ نہ رکے تو گولی چلا دی۔ شیرے کے سر اور سینے میں گولیاں لگیں۔ ایک ساتھی کا ٹخنہ زخمی ہوا دوسرا صاف بچ گیا۔

شیرے نے وہیں جان' جان آفریں کے حوالے کر دی۔ اس نے پاکستان زندہ باد کہا اور پھر زور سے چیخا "ماں میں آرہا ہوں۔"

اس کے بعد اس کی گردن ڈھلک گئی۔

رات زخمی اور شیرے کی لاش سی ایم ایچ لاہور میں پہنچی اور ضروری کارروائیوں کے بعد اسے نہایت عزت و احترام کے ساتھ اس کے گاؤں پہنچایا گیا۔

جس نے سنا تڑپ اٹھا۔ دھاڑیں مار مار کر رویا۔ حمیداں تو کچے فرش پر لوٹنیاں لینے لگی۔ بھا فضل اور بھابی کے بینوں نے دل دہلا دیے۔

جیراں سکتے میں آگئی۔ نہ روئی نہ ہی چیخی چلائی۔ بس ٹکر ٹکر سب کو تکتی رہی۔

جب فوجی جوانوں نے شیرے کو اسٹریچر سے اٹھا کر اندر لے جانا چاہا تو ایک جم غفیر امنڈ آیا۔ بڑی مشکل سے جوان لاش کو اندر لائے اور سامنے بچھے ہوئے لال پایوں والے پلنگ پر ڈال کر سر جھکا کر کھڑے ہو گئے۔ چیخ پکار' گریہ و زاری' آہ و فریاد اور سینہ کوبی سے دل پھٹے جا رہے تھے۔

جیراں پھٹی پھٹی آنکھوں سے سب کچھ دیکھ رہی تھی۔ عورتیں اس کے گلے لگ لگ کر بین کر رہی تھیں لیکن وہ بت بنی ہوئی تھی۔

www.freepdfpost.blogspot.com

اس نے پلنگ کی طرف دیکھا۔ جس پر شیرا پڑا تھا۔ لوگوں کے ہجوم کو چیرتے ہوئے وہ ادھر لپکی اور چلائی۔ "شور نہ مچاؤ۔ شور نہ مچاؤ۔ شیرے کو سونے دو۔ آنکھ کھل جائے گی اس کی' چپ کرو" وہ اپنے منہ پر بار بار ہاتھ رکھ کر لوگوں کو چپ رہنے کے اشارے کرنے لگی۔ لوگ چیخیں مار مار کر رونے لگے۔ شیرا جب بہت چھوٹا تھا اور چوہدری کے پلنگ پر چوری چھپے چڑھ کر لیٹ جایا کرتا تھا تو اسے ایک دم ہی گہری نیند آلیتی تھی وہ بڑے مزے سے نیند لیا کرتا تھا۔

آج تو وہ اپنے پلنگ پر لیٹا تھا..... اپنے پلنگ پر۔ جس کا حصول اس کی زندگی کی سب سے بڑی امنگ تھی۔ شاید اسی لئے وہ آج اتنی گہری نیند سویا تھا کہ اس کے جاگنے یا اٹھ جانے کا امکان ہی نہیں تھا۔

جیراں ہوش و خرد کی دنیا سے دور صرف ایک ماں تھی نا۔ جو نہیں چاہتی تھی کہ لوگ شور مچا کر اس کے بیٹے کی نیند خراب کریں۔

جیراں اب بھی گاؤں کی گلیوں میں گھومتی پھرتی ہے۔ لوگ سے جھلی کہتے ہیں۔ لیکن وہ جب بھی لوگوں کو شور مچاتے یا زور زور سے باتیں کرتے دیکھتی ہے تو ہاتھ منہ پر رکھ کر کہتی ہے "چپ کرو۔ شور نہ کرو شیرے کو سونے دو۔ اس کی آنکھ کھل جائے گی۔ چپ کرو۔"

"وہ اس شعور سے عاری ہو چکی ہے کہ شیرا جس نیند سویا ہے وہ ٹوٹنے والی نہیں ہے۔ وہ تو روز حشر ہی ٹوٹے گی۔

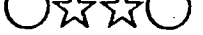

فون گزیدہ

گھر میں داخل ہوتے ہی میری نگاہ لاؤنج میں پڑے سامان پر پڑی' بے شمار کریٹ اوپر تلے رکھے تھے۔ کہیں بکس تھے' کہیں پیٹیاں' گٹھریاں اور بیگ بھی اوپر تلے بے ترتیبی سے پڑے تھے۔ کہیں بنڈل اوپر تلے رکھے تھے اور کہیں رول کئے ہوئے قالین اور دریاں تھیں۔ سامان اتنا زیادہ اور الٹ پلٹ تھا کہ دیکھ کر مجھے گھبراہٹ سی ہونے لگی۔ میں دروازے کے قریب ہی بڑے ائیر کنڈیشنر کے کریٹ پر بیٹھ گئی اور سر ہاتھوں پر گرا لیا۔

"کیا ہوا؟" سجاد جلدی سے اندر آتے ہوئے بولے۔ وہ گاڑی میں سے کچھ سامان نکال کر لا رہے تھے۔ سکندر خان ان کے پیچھے پیچھے تھا اور اس نے بھی کار کی ڈگی سے نازک نازک چیزوں کے ڈبے اٹھا رکھے تھے۔

میں نے سر اٹھا کر سجاد کی طرف دیکھا اور بولی۔ "توبہ! سامان کو دیکھ کر وحشت ہو رہی ہے۔"

"نئی بات تھوڑا ہی ہے۔" سجاد بولے۔ "پوسٹنگ ہوئی ہے تو سامان اسی طرح آنا تھا۔"

"اچھا ہوتا ہم لوگ پہلے امی کی طرف چلے جاتے۔ بچوں کو بھی دیکھ لیتے اور کچھ تکان بھی اتار لیتے۔"

"بندے کی تو یہی رائے تھی۔ محترمہ ہی کو نیا گھر دیکھنے کا شوق تھا۔ اسلئے سیدھے ادھر آنے کو کہا۔"

www.freepdfpost.blogspot.com

میں چپ رہی تو سجاد خود ہی بولے۔ "کوئی بات نہیں' سامان چیک تو کرنا ہی تھا کہ ٹھیک ٹھاک پہنچ گیا ہے یا نہیں۔"

"سب ٹھیک ہے سر!" سکندر بولا۔ "ہر چیز میں نے پوری احتیاط سے ٹرک سے اتروائی تھی۔"

"خدا کا شکر ہے۔" میں نے کہا۔ "وہ شیشے والی میزیں سلامت ہیں نا سکندر خان۔"

"جی بالکل۔ وہ میں نے سامنے والے کمرے میں رکھوا دی ہیں۔ صوفہ اور دوسرا فرنیچر اس کمرے میں ہے۔" اس نے برابر والے کمرے کیطرف اشارہ کیا۔

"سب سلامت ہے نا؟" سجاد نے پوچھا۔

"جی بالکل۔" سکندر نے جواب دیا۔

میں کریٹ پر سے اٹھی اور سامان کو دیکھنے لگی۔ دو ایک بیگ ہی اٹھائے تھے کہ سجاد بولے۔ "اوں ہوں' آج سامان کو نہیں چھیڑنا۔"

"کیوں؟" میں نے پوچھا۔

"بھئی' اب ہم لوگ آ گئے ہیں۔ دو چار دن میں آرام سے گھر سیٹ ہو جائے گا۔ کچھ لوگ کل بلوا لوں گا' وہ بھاری بھاری چیزیں اٹھا کر جہاں رکھنا ہوں گی رکھیں دیں گے۔ کوئی ایسی جلدی نہیں۔ نہ ہی تم یہ کام اعصاب پر سوار کرو۔ آرام سے بیٹھو۔ کچھ دیر تک امی کی طرف چلتے ہیں۔ سکندر خان تم سارے تگ گن لو۔ تاکہ بیگم صاحبہ کی تسلی ہو جائے۔"

"ٹھیک ہے سر!" وہ بولا۔

"تم گھوم پھر کر دیکھ لو۔" سجاد نے مجھ سے کہا۔

"دو بیڈ روم اوپر ہیں۔ ایک نیچے۔ گیسٹ روم بھی ہے۔ دیکھ لو۔ اچھا گھر مل گیا ہے۔ لاؤنج خاصا کشادہ ہے۔ باتھ رومز بھی بڑے بڑے ہیں۔ اور سب سے بڑی بات کہ فون بھی لگا ہوا ہے۔"

"ہاں' یہ سب سے بڑی خوبی ہے اس کی۔" میں نے مسکرا کر سجاد کی طرف دیکھا۔

"نمرہ بھی اسی بات سے خوش ہے کہ یہاں فون بھی ہے۔" سجاد بولے۔

میں مسکرا دی۔ میری اور نمرہ کی ضروری فون تھا۔ میں بھی جب تک دن میں کئی کالیں

نہ کر لوں چین نہیں پڑتا اور نمرہ بھی سہیلیوں کو لمبے لمبے فون کرنے کی عادی ہے۔ رانگ نمبر پر فون کر کے لوگوں کو بے وقوف بنانے میں بھی اسے مزہ آتا تھا۔ جوانی میں یہی عادت میری بھی تھی اور اب بھی اگر کوئی فون رانگ نمبر کا آتا تو میں دو چار باتیں کرنے کے بعد ہی بند کیا کرتی تھی۔ کوشش ہوتی کہ فون کرنے والے کو بے وقوف بنا ڈالوں۔ فون کی ہمیں واقعی بہت خوشی تھی۔

سجاد مجھے گھر دیکھنے کو کہہ رہے تھے۔ لیکن میں نے وہیں کھڑے کھڑے اردگرد نگاہ دوڑائی۔ لاؤنج کی بڑی سی شیشوں والی کھڑکی سے پچھلی طرف کا چمن دکھائی دے رہا تھا۔ جو چھوٹا سا تھا لیکن درختوں اور بیلوں کی وجہ سے خاصا سرسبز تھا۔

"بہت تھک گئے ہیں۔" سجاد بولے۔

"آپ نے تو اتنی لمبی ڈرائیو کی ہے۔ میں تو گاڑی میں بیٹھے بیٹھے تھک گئی ہوں۔"

"گھر اچھا مل گیا ہے۔ سیٹ ہو گیا تو ساری تکان دور ہو جائے گی۔"

"ہاں گھر واقعی اچھا ہے۔ لیکن میں ابھی اوپر نہیں جا سکتی' نہ ہی گھوم پھر کر دیکھ سکتی ہوں۔"

"تو پھر چلو' امی کی طرف چلتے ہیں۔"

سکندر تگ گن لے۔ تسلی ہو جائے کہ سامان پورا ہے۔ کھولیں گے تو کل ہی۔"

"ٹھیک ہے۔ باہر لان میں چل کر بیٹھتے ہیں۔"

"ہم دونوں باہر آ گئے۔ چمن کچھ زیادہ بڑا نہیں تھا۔ لیکن گھاس ترشی ہوئی تھی۔ کیاریوں میں موسمی پھول لہرا رہے تھے۔ دو ایک درخت بھی تھے اور کچھ بیلیں بھی۔ چمن کو اور بھی خوبصورت بنایا جا سکتا تھا۔ کرسی پر بیٹھتے ہوئے چمن کا جائزہ لیتے ہوئے میں سوچ رہی تھی۔

"چائے کی طلب بڑھ رہی ہے۔" سجاد کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولے۔

"وہ تو اب امی کے گھر جا کر ہی ملے گی۔" میں نے کہا۔ "ابھی سگریٹ ہی سے چائے کا شوق پورا کریں۔"

[illegible] میں ہوئی تھے۔ یہ میرا اپنا شہر تھا۔ امی کا گھر یہیں تھا۔ سہیلیاں

www.freepdfpost.blogspot.com

تھیں۔ کچھ سسرالی عزیز بھی تھے۔ سجاد کے کچھ دوست بھی یہاں تھے۔ میں لاہور آنے کو بیتاب تھی۔ چند دن پہلے اپنے تینوں بچوں نمرہ' زبیر اور حرا کو امی کے گھر بھیج دیا تھا۔ ہم لوگ آج ہی یہاں پہنچے تھے۔ میں نے ہی سجاد سے کہا تھا کہ پہلے گھر دیکھیں گے' پھر امی کی طرف جائیں گے۔ یہ گھر ہمیں سول ایریا میں ملا تھا۔ میرے میاں فوج میں کرنل تھے۔ فوجی بنگلے ملنے میں تاخیر ہو جاتی تھی۔ اس لئے ہم نے یہ گھر لے لیا تھا۔ گھر مجھے پسند آگیا تھا۔

"چائے مل جاتی تو۔" سجاد سگریٹ کا کش لیتے ہوئے بولے۔ میں کچھ کہنے کو تھی کہ گیٹ پر کسی نے بیل دی۔ سجاد نے وہیں سے بیٹھے بیٹھے کہا۔ "کون؟"

جواباً" ایک چودہ پندرہ سالہ لڑکا گیٹ سے نمودار ہوا۔ اس نے ہاتھوں میں ٹرے اٹھا رکھی تھی۔ میں نے سجاد اور سجاد نے میری طرف دیکھا۔

لڑکے نے آگے آتے ہوئے ہمیں سلام کیا اور ٹرے بڑھاتے ہوئے بولا۔ "سارہ آنٹی نے آپ کے لئے چائے بھجوائی ہے۔"

"چائے!" میں نے کہا۔

"جی۔ یہ آپ کے برابر والے گھر میں سارہ آنٹی رہتی ہیں۔ انہوں نے چائے بھجوائی ہے۔"

"ہم کچھ اور مانگتے یار۔" سجاد نے بے تکلفی سے لڑکے سے کہا۔ "چائے کی شدت سے طلب ہو رہی تھی۔ تم لے ہی آئے۔"

"انہوں نے ناحق تکلیف کی۔" میں نے تکلفاً" کہا۔ اور ٹرے لے کر خالی کرسی پر رکھ دی۔ نیپکن ہٹایا۔ تو دیکھا نفیس برتن تھے۔ چائے دانی اور دودھ دانی ڈھکی ہوئی تھی۔ ساتھ ایک پلیٹ میں بسکٹ رکھے تھے۔

"ہماری طرف سے بہت بہت شکریہ کہنا۔" میں نے لڑکے سے کہا۔

"جی' وہ آنٹی نے کہا ہے۔" لڑکا بولا۔ "رات کا کھانا بھی وہ بھجوا دیں گی۔"

"نہیں بھئی نہیں۔" دونوں ہی بولے۔

"انھوں نے مجھے یہی کہا تھا کہنے کو۔"

"نہیں بچے انہیں بول دینا کہ تکلیف نہ کریں۔" سجاد بولے

میں نے بھی کہا۔ "ہم لوگ ابھی اپنی امی کے گھر جا رہے ہیں۔ اس لئے کھانے کی ضرورت نہیں۔ بہت بہت شکریہ کہنا۔"

"اچھا جی۔" لڑکے نے واپس جانے کے لئے قدم اٹھایا تو میں بولی۔

"سنو"

"جی"

"تم ان کے بیٹے ہو؟"

"جی نہیں۔ میں سامنے گھر میں رہتا ہوں۔ آنٹی سارہ آپکے دائیں ہاتھ رہتی ہیں۔" اس نے ہاتھ سے سارہ کے گھر کی طرف اشارہ کیا۔

"بہت بہتر۔" میں نے کہا۔ "انہیں شکریہ کہنا برتن ہمارا اردلی انہیں دے آئے گا۔"

لڑکے نے سر ہلایا اور سلام کر کے چلا گیا۔

"شکر ہے" میں نے کرسی میں پھیلتے ہوئے کہا۔

سجاد ہنس کر بولے۔ "چائے مل گئی؟"

"نہیں صاحب' اچھے ہمسائے مل گئے۔"

"واقعی۔"

"آج کل اچھے ہمسائے کسی نعمت خداوندی سے کم نہیں ہوتے۔"

"بالکل۔ بالکل" سجاد نے سگریٹ کا کش لیا۔

میں چائے بنانے لگی۔ خوب گرما گرم اور مزے دار چائے تھی۔ ہم دونوں چائے پیتے ہوئے اس مہربان آنٹی سارہ کے اخلاق کی تعریفیں کرنے لگے۔

www.freepdfpost.blogspot.com

"نمرہ"

"جی امی"

"بھئی کیا کر رہی ہو۔ کمرہ سجا بعد میں لینا۔ پہلے اپنی چیزیں تو اٹھاؤ۔"

"آئی امی۔"

"حرا کو بھیج دو۔ یہ بیگ تو لے جائے۔"

"اچھا۔ آتی ہے۔"

میں لاؤنج میں ہی بیٹھی تھی۔ آج ہمیں اس گھر میں آئے تیسرا دن تھا۔ بڑا بڑا سامان مناسب جگہ پر رکھا جا چکا تھا۔ ڈرائنگ روم سیٹ ہو گیا تھا۔ بیڈ رومز میں بھی پلنگ وغیرہ ڈال دیئے گئے تھے۔ اب کچن ٹھیک کرنا تھا۔ ضرورت کے برتن تو آتے ہی نکال لئے تھے۔ باقی چیزیں ابھی ڈبوں اور کریٹوں ہی میں بند تھیں۔ بچوں کے کپڑوں کے بیگ اور کتابیں بھی میں نے نکال نکال کر میزوں پر رکھی ہوئی تھیں۔

نمرہ سولہ سترہ برس کی تھی۔ سیکنڈ ایئر کی طالبہ تھی۔ میں تو چاہتی تھی' اسے الگ بیڈ روم ہی دوں۔ لیکن گیارہ سالہ حرا اور نمرہ میں بڑی دوستی تھی۔ دونوں بہنیں ایک ہی کمرے میں رہتی تھیں۔ ہاں' زبیر نے اپنے لئے الگ کمرہ لیا تھا۔ وہ میٹرک میں تھا۔ اس سال امتحان دینا تھا۔ اچھی پوزیشن کے لئے تیاری کر رہا تھا۔

میں کچن کے سامان کے ڈبے اور کریٹ کھولے بیٹھی تھی۔ سکندر کو کام کے لئے بازار بھیجا تھا۔ سجاد دفتر جا چکے تھے۔ آج بھی دس بجے کے قریب ساتھ والی سارہ آنٹی نے چائے

بھجوائی تھی۔ تین دنوں سے وہ صبح شام چائے بھجوا رہی تھی۔ کھانے کے لئے بھی بہت اصرار تھا لیکن دوپہر کا کھانا سکندر لے آتا تھا اور رات ہم لوگ امی کے ہاں چلے جاتے تھے۔ چائے کے برتن میں نے خود بھی نکال لئے تھے۔ چینی دودھ پتی وغیرہ بھی منگوا رکھی تھی۔ لیکن وہ اتنے پیار بھرے اصرار سے چائے بھجواتیں کہ ان کی بے حد مزے دار چائے پینا ہی پڑتی۔

میں ابھی تک ان سے مل نہ سکی تھی۔ روز ہی چاہتی کہ کچھ وقت نکال کر ان کی طرف جاؤں گی۔ خود ان کا شکریہ ادا کروں گی۔ لیکن وقت ہی نہ ملتا۔

آج میرا ارادہ ان کی طرف جانے کا بن رہا تھا۔ اسی لئے میں کام جلدی سمیٹنا چاہ رہی تھی۔ میں نے پھر حرا کو آواز دی۔

"آئی امی۔"

"آئی آئی کی رٹ لگا رکھی ہے۔ دونوں بہنیں آؤ اور اپنا کاٹھ کباڑ اٹھا کر لے جاؤ۔ جگہ خالی کرو۔ تاکہ میں برتن نکال سکوں۔" میں نے چینی کے برتنوں والا کارٹن اپنے سامنے کرتے ہوئے کہا۔

نمرہ اور حرا دونوں ہی نیچے آ گئیں۔

"کیا کر رہی تھیں؟" میں نے پوچھا۔

"کمرہ ٹھیک کر رہے تھے ماما۔" نمرہ نے بیگ اٹھاتے ہوئے کہا۔

"پوسٹر لگا رہی تھیں امی دروازوں پر۔" حرا نے شوخی سے کہا اور..... اور..... سہیلی کو فون کی ٹرائی بھی۔"

"تیری مت تو نہیں ماری گئی نمرہ۔ پہلے سامان تو سمیٹ لو۔"

"بہت اچھا مدر۔" وہ شوخی سے بولی۔ لائیے' کون کون سا سامان ہے؟"

"یہ سب تمہارا ہی ہے۔"

"ٹھیک۔" اس نے دوسرا بیگ بھی کندھے پر ڈالا۔ اور ساتھ ہی کتابوں والا تھیلا بھی اٹھانے لگی۔

"وہ تو رکھ آؤ۔ یہ پھر لے جانا۔"

"اوکے۔" وہ بولی اور بیگ اٹھائے سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئی۔ حرا نے بھی دو ایک

www.freepdfpost.blogspot.com

چیزیں اٹھالیں۔

"دو تین چکر لگا کر سارا سامان لے جاؤ اوپر۔"

"اچھا امی۔"

وہ بھی اوپر چلی گئی۔

میں برتن نکال نکال کر میز پر رکھنے لگی۔ پیکنگ بہت اچھی کی ہوئی تھی۔ اس لئے نازک نازک برتن سلامت ہی نکل رہے تھے۔

میں کام میں مصروف تھی۔ حرا اور نمرہ بھی چکر بھی لگا چکی تھیں۔ کافی جگہ خالی ہو گئی تھی۔ میں نے خالی کارٹن ادھر ادھر کھیل دیا اور دوسرا ڈبہ اپنے سامنے کر لیا۔

اسے کھول ہی رہی تھی کہ دروازہ کھلا اور ایک خاتون اس میں نمودار ہوئی۔

"السلام علیکم۔" اس نے دروازے ہی میں کھڑے کہا۔

میں نے جواب دیتے ہوئے اٹھ کر اس کا استقبال کیا۔ "آیئے۔"

آپ تو ابھی مصروف ہیں۔" وہ بولی۔ "میں سمجھی فارغ ہو چکی ہوں گی۔ اس لئے چلی آئی۔ آپ کام کریں، میں پھر آجاؤں گی۔"

وہ مڑنے ہی والی تھی کہ میں نے آگے بڑھ کر کہا۔

"کام تو ہوتا رہے گا۔ آپ نے آنے کی زحمت کی ہے تو تشریف رکھیئے۔"

"وہ کچھ ہچکچائی۔

میں نے اصرار کیا تو اس نے قدم بڑھایا۔

"ڈرائنگ روم میں بیٹھیں۔" میں نے کہا تو وہ ایک کرسی پر سے چادر اٹھا کر میز پر رکھتے ہوئے میرے قریب ہی بیٹھ گئی اور رسانیت سے بولی۔ "آپ کام کریں بلکہ مجھے بھی بتائیں میں آپ کا ہاتھ بٹاتی ہوں۔"

"شکریہ۔" میں نے مسکرا کر کہا۔

"میرا نام سارہ ہے۔" وہ بولی۔ تو میں نے خوش ہو کر اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

"اچھا آپ ہیں سارہ بہت تکلیف کر رہی ہیں آپ۔ چائے کے لئے بہت بہت شکریہ۔ پلیز اب زحمت نہ کیجئے گا۔ اب تو کچن کھل گیا ہے میرا۔"

"کوئی بات نہیں مسز۔"

"سجاد۔" میں نے مسکرا کر کہا۔ "ویسے میرا نام سنیہ ہے آپ مجھے اس نام سے بھی پکار سکتی ہیں۔"

"شکریہ" وہ بولی۔

پھر ہم دونوں باتیں کرنے لگے۔ رسمی سی تکلفاتی سی باتیں۔

اسی دوران نمرہ نیچے آگئی۔ اس نے خاتون کو دیکھتے ہی مودبانہ سلام کیا۔

"آپ کی بیٹی ہے؟" سارہ نے پیار سے نمرہ کو دیکھ کر کہا۔

"جی بڑی بیٹی۔ اس کا نام نمرہ ہے، چھوٹی حرا ہے۔ بیٹے کا نام زبیر ہے۔"

"اور آنٹی آپ؟" نمرہ نے ہنس کر کہا۔

"یہ آنٹی سارہ ہیں۔" میں نے نمرہ سے کہا۔

"چائے والی آنٹی۔" ہنس کر نمرہ نے کہا۔

وہ بھی مسکرا دی اور بولی۔ "کیوں بھئی، ہمارا تعارف چائے کے حوالے سے کیوں؟"

نمرہ نے بھی شوخی سے کہا۔ "آنٹی فی الحال تو ہم لوگ آپ کو اسی حوالے سے جانتے ہیں۔ اتنی مزے کی چائے بھجواتی ہیں آپ صبح شام۔"

وہ مسکرانے لگی۔

"ویسے آنٹی۔" نمرہ نے کہا۔ "ہم لوگ آپ کے حسن اخلاق سے بڑے متاثر ہوئے ہیں۔ بہت خوش ہیں ہم کہ آپ جیسے نیبر ہمیں ملے۔"

"آپ لوگ بھی تو اچھے ہیں۔" اس نے کہا۔

"یہ تو آپ کو پتا چلے گا، جب ہم سے ملیں جلیں گی۔" نمرہ کھلکھلا کر ہنس دی۔

"بہت شوخ ہے۔" میں نے کہا۔ "اور باتونی بھی بڑی ہے۔"

"عمر ہی ایسی ہے۔" وہ بھی زیر لب مسکرائی۔ "شوخی و شرارت حدود کے اندر رہے تو یہ اس عمر کا حسن ہے۔"

"واقعی" نمرہ پھر ہنس پڑی۔

میں اور وہ بھی مسکرانے لگیں۔

www.freepdfpost.blogspot.com

نمرہ چیزیں اٹھا کر اوپر چلی گئی تو میں نے اس سے کہا "نمرہ مجھ ہی پر گئی ہے۔ میں بھی اس عمر میں بڑی شوخ اور شرارتی ہوا کرتی تھی۔"

"بچے ماں باپ ہی کا عکس ہوتے ہیں۔" اس نے بڑے متین بلکہ کسی حد تک سنگین لہجے میں کہا۔

میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا لیکن وہ ہاتھ بڑھا کر وہ نفیس گلاس اٹھا رہی تھی جو میز کے کنارے پر رکھا تھا۔

"بہت خوبصورت اور نازک ہے۔"

"شکر ہے' سارے گلاس صحیح و سلامت رہے۔" میں نے کہا "یہ ڈبا میں اپنے ساتھ گاڑی میں لائی تھی۔

"لائیے مجھے نیپکن دے دیجئے! میں یہ برتن صاف کرتی جاؤں۔" اس نے چند ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد کہا۔

"ہائے نہیں۔" میں جلدی سے بولی۔ "آپ تکلیف نہ کریں۔"

"تکلیف کیسی۔" وہ خود ہی سفید نیپکن ہاتھ میں لیتے ہوئے بولی۔ "سنعہ بہن میں بے کار بیٹھی ہوں۔ آپ کا ہاتھ بٹا دوں گی تو کیا فرق پڑے گا' بے فکر رہئے میں کام کرنے کی عادی ہوں۔"

اس کے اصرار کے باوجود مجھے اچھا نہیں لگا کہ پہلی ہی ملاقات میں اس سے کوئی کام لوں۔ لیکن میں اس کے حسن اخلاق سے بڑی متاثر ہوئی۔

اس نے زبردستی شیشے کے نازک گلاس صاف کر کے رکھے۔ کرسٹل کے گلدان پونچھے اور کچھ آرائشی چیزیں جھاڑ پونچھ کر رکھ دیں۔

اتنے میں سکندر خان دوپہر کے کھانے کے لئے ضروری اشیاء لے آیا۔ میں نے اس سے اسکوائش بنا کر لانے کو کہا۔

"سنعہ بہن!" سارہ نے گلاس لیتے ہوئے کہا۔ اس تکلف کی ضرورت تو نہیں تھی۔ آپ خود مصروف ہیں' اتنے کام کرنے کو ہیں۔"

"سب نپٹ جائیں گے۔" میں نے دوسرا گلاس اٹھاتے ہوئے کہا۔ "آرام آرام سے

اتنی جلدی کا ہے کی۔ یہیں رہنا ہے' ہفتے کی جگہ دو ہفتے میں گھر سیٹ ہو جائے گا۔"

"وہ تو ہے پھر بھی میں حاضر ہوں۔ کسی چیز کی ضرورت ہو۔ تو بڑی بہن سمجھ کر کہہ دینا۔ آپ لوگ ابھی یہاں نئے ہیں اور شاید سول کے علاقے میں رہنے کا بھی پہلا تجربہ ہے۔"

"ہاں شادی کے بعد تو پہلی دفعہ سول علاقے میں آئے ہیں۔" میں نے گلاس خالی کرتے ہوئے کہا اور پھر مسکرا کر بولی۔ "ویسے میں لاہور ہی کی رہنے والی ہوں میری امی گلبرگ میں رہتی ہیں۔ شادی سے پہلے سول علاقے ہی میں رہتی رہی ہوں۔"

وہ ہلکا سا سپ لیتے ہوئے مسکرا دی۔

"آپ یہاں کب سے ہیں؟" میں نے گلاس واپس ٹرے میں رکھتے ہوئے پوچھا۔

"جب سے پیدا ہوئی ہوں۔" وہ ایک گہری سانس لیتے ہوئے بولی۔ یہ میرے والدین کا گھر ہے۔"

میں ایک لمحے کو تذبذب میں پڑ گئی۔ کیا سارہ غیر شادی شدہ تھی۔ وہ ابھی تک مس ہی تھی یا؟ اس کی عمر لگ بھگ پینتالیس سال تھی۔ جوانی میں بے حد خوبصورت ہو گی۔ اب بھی وہ بہت اچھی لگ رہی تھی۔ وہ اپنی عمر سے یقیناً" زیادہ لگ رہی تھی۔ چہرے پر بڑی سنجیدہ چھاپ تھی۔ اس کی مسکراہٹ بھی متین سی تھی اور اس کی آنکھیں.....

جو یقیناً" بہت خوبصورت ہوں گی۔ اب گہرے گہرے سرمئی حلقوں کی زد میں تھیں۔ ان آنکھوں میں لگتا تھا اضطراب منجمد ہو گیا ہے۔ آنسوؤں کی نمی بھی محسوس ہوتی تھی۔ جانے اس کی آنکھوں کی ساخت ہی ایسی تھی۔ یا وقت نے کوئی گھاؤ دے دیئے تھے جن کا دکھ وہ اب تک سہتے ہوئے تھی۔

کیا یہ گھاؤ؟

ناکتخدائی کے تھے؟

یا

کوئی اور بات تھی۔

بہر حال میں اس سے اتنی بے تکلف تو تھی نہیں جو پہلی ہی ملاقات میں یہ ذاتی سا سوال اس سے کرتی..... بات کرنے کو میں نے پوچھا۔

www.freepdfpost.blogspot.com

"آپ کے ساتھ اور کون رہتا ہے؟"

"کوئی بھی نہیں۔ اکیلی ہوں۔ اوپر کا پورشن کرائے پہ اٹھا رکھا ہے۔ نچلے میں میری رہائش ہے۔"

"کسی دن آؤں گی۔ تو دیکھوں گی آپ کا گھر۔"

"ضرور۔ اب آپ یہاں آئی ہیں تو انشاءاللہ ملتے ہی رہیں گے۔"

"بالکل۔"

"کچھ دیر ہم دونوں رسمی سی باتیں کرتی رہیں۔ پھر وہ اٹھتے ہوئے بولی۔" آپ کا بہت وقت لیا میں نے۔ اب چلوں۔"

"میں بھی اٹھ کھڑی ہوئی۔

وہ دروازے کے بجائے کچن کی طرف بڑھی اور بولی "سودا جو آپ نے دوپہر کے کھانے کے لئے منگوایا ہے مجھے دے دیجئے۔ میں پکا کر بھیج دوں گی۔"

"نہیں نہیں۔" میں جلدی سے بولی۔" سکندر پکا لے گا۔ آپ ناحق تکلیف کریں گی۔

"بہت برا نہیں پکاتی میں۔" وہ مسکرائی۔

اس کی آنکھوں کا آزار اس مسکراہٹ سے کچھ زیادہ ہی واضح ہو گیا۔ جانے کیوں میں کچھ بے چین سی ہو گئی۔

وہ پھر خود ہی بولی۔ "دو چار دن اگر آپ میرے ہاں کا پکا ہی کھا لیتیں تو مجھے خوشی ہوتی۔ آپ نے کھانے بھجوانے سے مجھے منع کر دیا' آپ کی مرضی۔ لیکن آپ ہی کی چیزیں لے جا کر پکا بھیجوں' اس میں تو آپ کو اعتراض نہیں ہونا چاہئے۔ آپ اپنا کام کریں۔ سکندر کچن ٹھیک کرنے میں آپ کی مدد کرے گا۔ میں کھانا بنا کر بھیج دوں گی۔"

"ہائے اللہ' آپ کیوں زحمت کرتی ہیں۔"

"ہمسایوں کے کچھ حقوق ہوتے ہیں۔"

"وہ تو ہے۔ لیکن۔"

"میں بالکل فارغ ہوں۔ مجھے خوشی ہو گی کہ آپ کا کوئی کام کروں۔"

"میں مجبور ہو گئی۔ اور بولی۔ اچھا نوازش شکریہ۔۔۔ آپ کے گھر میں چیزیں بھجوا دیتی ہوں۔"

"ٹھیک ہے۔ وہ بولی اور لاؤنج کے دروازے سے باہر نکل گئی۔ میں اس کے اخلاق و کردار سے بے حد متاثر ہوئی۔

ان دو دنوں میں محلے کی چند عورتیں میرے ہاں آئی تھیں' ملنے کے لئے۔ سب نے رسمی اور تکلفاتی جملے بھی کہے تھے۔" کوئی کام ہو تو بلا جھجک کہہ دیجئے گا۔"

"ہمارے لائق کوئی خدمت؟"

"تکلف نہ کیجئے گا۔ ہم خدمت کے لئے حاضر ہیں۔"

میں نے سب کا شکریہ ادا کیا تھا۔ لیکن جو پاک خلوص اور پیار سارہ کے رویئے میں تھا اور عملاً" جس طرح وہ اپنی خدمات پیش کر رہی تھی' اس سے اس کی عظمت عیاں تھی۔ ظاہر ہے' سب ہمسایوں سے زیادہ میں اسی سے متاثر اور مرعوب ہوئی تھی۔

www.freepdfpost.blogspot.com

محلے کی دو تین عورتیں آئی بیٹھی تھیں۔ مسز اظہر خاصی شوخ اور باتونی عورت تھی۔ مسز وقار اپنے نام ہی کی طرح باوقار تھی۔ اور زبیدہ ہمایوں تیز طرار اور گھاگ قسم کی عورت تھی۔ وہ سب مجھے ملنے آئی تھیں۔ میں مصروفیت کی بنا پر ایک ایک دفعہ ہی ان کے گھر گئی تھی۔ اور یہ خواتین آج تیسری مرتبہ میرے ہاں آئی تھیں۔ ہاں میں مصروفیت کے باوجود سارہ کے ہاں کئی دفعہ گئی تھی۔ نمرہ اور حرا بھی اکثر آنٹی سارہ کے پاس جاتی رہتی تھیں۔ دونوں بچیوں کا کہنا تھا کہ سب آنٹیوں میں سے سارہ آنٹی سب سے اچھی اور پیاری ہیں۔

اسی لئے جب محلے کی دوسری عورتیں میرے ہاں آتیں تو نمرہ اور حرا صرف سلام ہی کرتیں اور اوپر چلی جاتیں۔ چائے وغیرہ سکندر ہی بنا کر پیش کرتا۔

گپ شپ لگانے کے لئے ان عورتوں کا ساتھ بھی کچھ برا نہ تھا۔ ان کی وساطت سے مجھے محلے بھر کے لوگوں کا تعارف حاصل ہو گیا تھا۔ بہت سوں کے مالی حالات کا علم ہوا تھا۔ کچھ کے رہن سہن کے بارے میں معلومات حاصل ہوئی تھیں۔ جو خوش اخلاق لوگ تھے' ان کا پتا چلا تھا۔ جو بد قسم کے تھے ان سے آگہی ہوئی تھی۔

یہ تینوں عورتیں ہر فرد کے بارے میں خاصی معلومات رکھتی تھیں۔ کسی کی تعریف' کسی کی برائی۔ کسی کے نقص نکالتیں۔ کسی کو سراہتیں۔

لیکن ان سب کی سارہ کے متعلق ایک ہی رائے تھی۔ کسی نے سارہ کی برائی نہیں کی تھی۔ نقص نہیں نکالے تھے۔ برا نہیں کہا تھا۔ بلکہ میں نے محسوس کیا کہ وہ سب بڑے احترام سے سارہ کا نام لیتی تھیں۔

مجھے سارہ کے متعلق تجسس تھا۔ وہ ساری عمر اسی گھر میں کیوں بتا رہی تھی۔ میں اس

کے متعلق جاننے کی خواہش مند تھی۔ اسی لئے آج جب سب سارہ ہی کی باتیں کر رہی تھیں۔ میں نے ان سے پوچھا "یہ سارہ کی امی کا گھر ہے۔"

"ہاں۔" مسز اظہر بولی۔

میں کچھ کہنے ہی کو تھی کہ مسز وقار نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔ "ماں بے چاری بھی سارہ ہی کے غم میں مر گئی۔ اب تو یہ اکیلی ہی ہے بے چاری۔"

"کیوں کیا ہوا تھا سارہ کو؟" میں نے جلدی سے پوچھا۔

"بد قسمت ہے۔" زبیدہ ہمایوں نے کہا۔"

"شادی ہوئی تھی ان کی۔" میں نے تجسس سے کہا۔

"ہاں شادی ہوئی تھی۔" مسز وقار نے کہا۔ لیکن تیسرے سال ہی علیحدگی ہو گئی۔ ایک بیٹا بھی ہوا تھا۔ وہ باپ ہی کے پاس ہے۔ اسے تو ملنے بھی نہیں دیتے وہ لوگ۔"

میں نے حیرانی سے سب کی طرف دیکھا۔ یقین نہیں آ رہا تھا کہ سارہ جیسی عورت کے ساتھ ایسا سانحہ پیش آیا۔ میں نے بے تابی سے پوچھا۔ "کیا اس کا شوہر اچھا آدمی نہیں تھا؟"

"بہت اچھا تھا۔"

پھر کیا ہوا؟"

"اللہ جانے' شادی بڑی دھوم دھام سے ہوئی تھی۔ شوہر بھی بہت اچھا اور مال دار آدمی تھا۔ پڑھا لکھا بھی۔"

"سارہ میں بھی تو کوئی کمی نہ تھی۔ صورت سیرت' پیسہ تعلیم سب کچھ تھا۔ اس پر اکلوتی بیٹی۔

"ہائے ہائے۔" میرے منہ سے نکلا تو مسز اظہر بولی۔ اچھے بھلے تھے۔ خوب خوش حال۔ نہ تو سارہ کو کبھی دکھی دیکھا تھا۔ نہ ہی اس کے میاں کی کبھی شکایت سنی تھی۔ بیٹے کی پیدائش پر تو پورا جشن منایا گیا تھا۔"

"پھر پھر کیا ہو گیا؟"

"بس جو کچھ بھی ہوا ایکا ایکی ہوا۔ ٹھیک سے تو کسی کو بھی معلوم نہیں۔ سارہ اور اس کی امی نے سارے غم اپنے اندر ہی اتار لئے تھے۔ پوچھنے پر بھی کبھی نہیں بتایا کہ وجہ نزاع کیا

www.freepdfpost.blogspot.com

تھی۔ بس یہی کہتیں 'تقدیر کا فیصلہ تھا' ہو گیا۔"

مجھے یہ سن کر بہت ہی دکھ ہوا۔ سارہ سے میری ہمدردیاں دوچند ہو گئیں۔ اتنی مخلص اتنی سلیقہ مند' اتنی تعلیم یافتہ اور اتنی ہمدرد عورت تقدیر کا شکار ہو گئی تھی؟

تینوں عورتیں اس روز کافی دیر بیٹھی باتیں کرتی رہیں۔۔۔ سارہ کی باتیں۔ اس کی شادی کی باتیں۔ اس کی خوشحال ازدواجی زندگی کی باتیں اور اس کے ایکا ایکی اجڑنے کی باتیں اور پھر اس کے صبر اور حوصلے کی باتیں۔

"بیٹے کے لئے بہت زیادہ تڑپا کرتی تھی شروع شروع میں۔" مسز اظہر نے کہا۔

"لیکن ظالم آدمی نے ایسا دل پتھر کیا کہ صورت نہ دیکھنے دی۔"

"گیارہ بارہ سال کی عمر میں تو باہر بھیج دیا تھا پڑھنے کے لئے۔"

"تب سے اب تک وہ وہیں ہے۔ باپ سنا ہے' ہر سال جا کر مل آتا ہے۔"

"دوسری بیوی سے اولاد نہیں ہوئی۔"

"میں نے بلندی سے پوچھا۔" تو اس نے دوسری شادی بھی کر لی؟"

"ہاں کافی دیر بعد کی تھی لیکن کر لی تھی۔"

"شاید پانچ برس بعد۔"

"ہاں۔"

"سارہ سے کبھی آپ لوگوں نے پوچھا نہیں۔" میں نے کہا۔ جھگڑا کس بات کا تھا؟"

"بھئی کوئی بتائے تو تب نا۔ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی۔ افواہیں بہتیری اڑیں۔ لیکن آفریں ہے ماں بیٹی کے صبر پر۔ لب ہی سی لئے۔ اچھی بات کی تائید کی نہ بری بات کی تردید۔"

"اف!" میں بے حد دکھی ہو گئی۔ سارہ کے لئے میرا دل درد سے بھر گیا۔

"نمرہ!"

نمرہ!"

اے نمرہ!"

وہ فون پر اپنی کسی سہیلی سے گپ شپ لگا رہی تھی۔ یا حسب عادت کسی کو بے وقوف بنا رہی تھی۔ اس لئے میری دو تین آوازوں پر بھی کوئی جواب نہ دیا تو میں نے زور سے اسے پکارا۔ "بند کرو فون نیچے آؤ۔

"ایک منٹ' بس۔" اس نے فون روک کر کہا۔ اور پھر یہ ایک منٹ پورے سات منٹ پر پھیل گیا۔

مجھے اس سے کوئی کام تو نہیں تھا۔ میں تو اسے سارہ آنٹی کی ٹریجڈی کا بتا کر اپنا دل ہلکا کرنا چاہتی تھی۔ میں اس وقت بڑی دکھی اور بڑی جذباتی ہو رہی تھی۔

"کیا ہے امی؟" نمرہ تیزی سے سیڑھیاں اترتے ہوئے ہنسے جا رہی تھی۔ "اتنا مزہ آ رہا تھا۔ ایک دکان دار کو خوب فول بنا رہی تھی میں۔"

"میں نے اس کی بات سے محظوظ ہونے کے بجائے کہا۔" ہائے نمرہ۔ پتا ہے' آنٹی سارہ کی ڈائیورس ہو چکی ہے' اور اس کا ایک بیٹا بھی ہے۔"

"نہیں۔" نمرہ ایک دم سنجیدہ ہو کر بے یقینی سے بولی۔ پھر صوفے پر میرے پہلو میں بیٹھتے ہوئے بولی۔ "آپ سے کس نے کہا؟

میں نے اسے پوری داستان سنا ڈالی۔ میری طرح نمرہ بھی دلگرفتہ سی ہو گئی۔" ہائے اللہ' اتنی اچھی آنٹی۔ ہیں۔۔۔۔ یقین نہیں آتا۔

www.freepdfpost.blogspot.com

"بہت دکھی ہے' بے چاری۔"

"لگتی تو نہیں۔"

"ظاہر نہیں کرتیں۔ بڑی حوصلہ مند خاتون ہیں؟"

"بے چاری آنٹی۔"

میں اور نمرہ دیر تک سارہ ہی کے متعلق باتیں کرتی اور سوچتی رہیں۔ میں نے تو دل ہی دل میں تہیہ بھی کر لیا کہ سارہ سے ساری باتیں خود پوچھوں گی۔ شاید بیس برس گزرنے کے بعد وہ اس معاملے میں کچھ زیادہ حساس نہ رہی ہو۔ یا میری دوستی کی بنا اور خلوص کی وجہ سے سب کچھ بتا دے۔

رات میں دیر تک سجاد سے بھی اسی کے متعلق باتیں کرتی رہی۔ سجاد کو بھی سن کر حیرانی ہوئی۔ سارہ کی شخصیت ہی ایسی تھی۔ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ..... زیست کے اتنے چرکے اور وار دل پہ لئے ہوئے جی رہی تھی۔

سارہ آئی ہوئی تھی۔ سکندر نے چائے کے ساتھ کباب بنائے ہوئے تھے۔ پودینے اور ہری مرچوں کی چٹنی بھی بڑی لذیذ تھی۔ سارہ کباب کھاتے ہوئے تعریف بھی کر رہی تھی۔ وہ اکثر دس گیارہ بجے آ جایا کرتی تھی۔ ہم دونوں ادھر ادھر کی باتیں کیا کرتیں۔ میں سارہ کی نجی زندگی سے پردہ اٹھانے کے لئے سوچتی تو رہتی تھی۔ لیکن جانے کیا بات تھی۔ میں اس سے اس بارے میں کچھ پوچھ نہ سکی اس کا رویہ ہی ایسا ہوتا تھا۔ کہ بات زبان پر آتی ہی نہیں تھی۔

اب ہم دونوں بہت اچھی دوست بن چکی تھیں۔ سارہ ان دنوں میرے بیٹے کو کچھ مضامین بھی پڑھایا کرتی تھی۔ اس کی بھی کوشش تھی کہ زبیر اچھے نمبر لے کر میٹرک کا امتحان پاس کر لے۔ کبھی کبھی حرا اور نمرہ بھی اپنی کتابیں اٹھا کر اس کے ہاں چل دیتیں۔ اور اپنی پڑھائی کی مشکلات اسے بتا کر اس سے مدد لیتیں۔

چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے سارہ نے نمرہ کے متعلق پوچھا "کہاں ہے وہ آج کل تو چھٹیاں ہیں؟"

"اوپر اپنے کمرے میں۔" میں نے کہا۔

"پڑھ رہی ہے؟"

"توبہ کریں۔ کزنز ہوں گی فون سہیلیوں کو۔ چھٹی ہو تو اس کا وہ ہے اور فون۔ اور آج تو اس کی سہیلی بھی آئی ہوئی ہے۔ بتا رہی ہوں گی کسی کو اب فون۔" میں نے دیکھا سارہ کے چہرے پر ایک ناگوار سا تاثر ابھرا۔ اس کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔

"کیوں۔ تجھے اچھا نہیں لگا۔ شاید اسے لڑکیوں کا فون پر کسی سے [illegible]

www.freepdfpost.blogspot.com

تھا۔ حالانکہ میرے خیال میں یہ بے ضرر سا شوق تھا۔

وہ کچھ بولی نہیں۔ آدھی پیالی چائے ویسی ہی واپس رکھ دی۔

"چائے ٹھنڈی تو نہیں ہو گئی۔" میں نے اسے چائے نہ پیتے دیکھ کر پوچھا۔

"نہیں نہیں۔" وہ اسی انداز میں بیٹھے بیٹھے بولی۔

"اور بنا دوں.....؟"

"نہیں، شکریہ۔"

"میں چپ ہو گئی۔ اس کا موڈ ایکا ایکی بدل گیا تھا۔ بات تو کوئی ہوئی نہ تھی۔ صرف نمرہ کے متعلق ہی میں نے بتایا تھا۔

لیکن اس میں اس طرح موڈ آف کرنے کی تو کوئی بات نہ تھی۔

میری چائے بھی بے مزہ ہو گئی اور میں نے بھی پیالی واپس رکھ دی۔ وہ چپ ہی بیٹھی تھی لیکن کچھ بے چین، کچھ مضطرب اور چہرے پر وہی ناگوار تاثرات۔

"میں چلتی ہوں۔" وہ ایک دم ہی اٹھ کھڑی ہوئی۔

میں اسے روکنے کو کچھ کہنے ہی والی تھی کہ اوپر سے نمرہ اور پنکی کے قہقہوں کی آواز سنائی دی۔ دوسرے لمحے دونوں آگے پیچھے سیڑھیاں پھلانگتی اور ہنسی سے دہری ہوتی نیچے آ رہی تھیں۔

"کیا ہوا؟" میں نے جلدی سے اٹھتے ہوئے نمرہ سے پوچھا۔

"ہائے امی۔" وہ مجھ سے لپٹ گئی اور خوشی میں دیوانہ وار مجھے چکر دے ڈالا۔"

"باؤلی ہو گئی ہے۔" میں نے اسے دونوں بازوؤں سے پکڑ لیا۔ پنکی بھی ہنسے جا رہی تھی۔ سارہ دونوں کو صرف تکے جا رہی تھی۔

نمرہ نے ہنسی روکتے ہوئے سارہ کو سلام کیا۔ پنکی نے بھی اس کی تقلید کی۔

"ہوا کیا ہے؟" میں نے نمرہ سے پوچھا۔

"ہائے مما۔" وہ پھر مجھ سے لپٹ گئی۔ وہ بہت مسرور تھی۔ برابر ہنسے جا رہی تھی۔ پنکی بھی ہنس رہی تھی۔

"کیٹس کیا ہے دونوں کو؟" میں نے نمرہ کو الگ کرتے ہوئے پوچھا۔

"بڑا مزہ آیا مما۔ آج ہم نے ایک آدمی کو خوب ستایا فون پر" نمرہ پر پھر ہنسی کا دورہ پڑا۔

"بے چارہ۔" پنکی نے کہا۔

"آج اس کی بیوی سے خوب لڑائی ہوئی۔" نمرہ بولی

"ہم نے اس کی بیوی کے خلاف خوب بڑکایا۔"

میں نے سارہ پر نگاہ ڈالی، اس کے چہرے کا رنگ متغیر ہو گیا تھا۔ بھنٹ کھنچ گئے تھے۔ اور بے چینی کے عالم میں وہ مٹھیاں بند کر رہی تھی۔

اسی لئے میں نے نمرہ کی شرارت سے محظوظ ہوتے ہوئے بھی اسے ڈانٹنے کی اداکاری کرتے ہوئے کہا۔

"بری بات نمرہ۔"

"صرف بری!" اچانک ہی سارہ دہاڑی۔ اور پھر چیخی۔ "بری، بہت بری، بہت ہی بری۔" اور اس کے ساتھ ہی اک زناٹے دار تھپڑ اس نے نمرہ کے پھول ایسے گال پر جڑ دیا۔

نمرہ تو کیا مجھے بھی جیسے دن میں تارے نظر آ گئے۔ نمرہ نے گال پر ہاتھ رکھ لیا اور پنکی ہونقوں کی طرح سارہ کو تکنے لگی۔ جو کھڑی غصے سے تھر تھر کانپ رہی تھی۔

سب کچھ اتنا غیر متوقع اور اچانک ہوا کہ کئی لمحے کوئی کچھ بول ہی نہ سکا۔ نمرہ کے ساتھ جیسے میرے ہوش بھی اڑ گئے تھے۔ اپنی جوان بچی کو تو میں ڈانٹنے سے بھی گریز کرتی تھی۔ اک غیر عورت نے اسے اتنا زوردار تھپڑ مارا تھا، کچھ سمجھ ہی نہیں آ رہا تھا کہ یہ کیوں ہوا؟

کئی لمحوں بعد جب میں نے نمرہ کو اپنے ساتھ لپٹا کر کچھ کہنے کو لب کھولنا چاہے تو سارہ نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ ڈھانپ لیا۔

پھر وہ ایک دم ہی تیز تیز قدم اٹھاتی وہاں سے چل دی۔

ہم تینوں ششدر اور حیران اسے یوں جاتے دیکھتے رہ گئے۔

"عجیب آنٹی ہیں۔" پنکی نے کئی لمحے گزر جانے کے بعد کہا۔

"اتنے زور کا تھپڑ مارا۔" میں نے نمرہ کے سرخ گال پر پیار کرتے ہوئے دکھی لہجے میں کہا۔

www.freepdfpost.blogspot.com

"انہیں حق کیا تھا۔ اس طرح مارنے کا۔" پنکی غرائی۔

"ان کی کوئی بات ہوتی تو بات بھی تھی۔" نمرہ کی خوبصورت آنکھوں میں نمی تیر رہی تھی۔

"دقیانوسی۔ جاہل عورت۔" میں بڑبڑائی۔

اور پھر ہم تینوں نے سارہ کے حسن سلوک' خلوص محبت اور عظمت کے جتنے بت تراش رکھے تھے' سب چور چور کر ڈالے۔ اسے برا بھلا کہا۔ بدتمیز' غیر مہذب' اجڈ گنوار۔ حتیٰ کہ پاگل تک قرار دے دیا۔ خوب خوب کوسا اسے رات کو ساری بات میں نے شہزاد کو بھی بتائی۔ وہ بھی سارہ کے فعل سے حیران ہوئے۔

فون اور خاص کر رانگ نمبرز پر فون کر کے لوگوں کو تنگ کرنا خود میری بھی بائی تھی۔ مجھے یاد ہے جب میں تھرڈ ایئر میں تھی تو ہمارے ہاں فون لگا تھا۔ سہیلیوں کو لمبے لمبے فون کرنے پر اماں سے ڈانٹ بھی پڑتی تھی' ور جب دو چار سہیلیاں میرے ہاں اکٹھی ہو جاتیں۔ تو میں فون چپکے سے اپنے کمرے میں لے آیا کرتی۔ اور ہم..... رانگ نمبر ملا ملا کر لوگوں کو ستایا کرتے۔ اتنا مزہ آتا کہ بس بیان سے باہر۔ میری دوست صائمہ بھی میری طرح لوگوں کو ستانے اور الو بنانے کی شوقین تھی۔ وہ تو باقاعدہ پلان بنا کر رانگ نمبر ڈائل کیا کرتی تھی۔

جب وہ آجاتی تو ہم دونوں فون سے چمٹ ہی تو جاتے اور لوگوں کو اتنا ستاتے کہ بعض اوقات گالیوں کی بوچھاڑ سننا پڑتی۔ جب ایسا ہوتا تو ہم ہنس ہنس کر جیسے پاگل ہو جاتے۔

ایک دفعہ ہم نے نمبر ڈائل کیا۔ وہ جوتوں کی دکان تھی۔ شاید سیل مین تھا۔ بڑے مہذب انداز میں بولا.....

"انگلش شوز سے بول رہا ہوں۔"

"میں بولی۔ "کیا مطلب؟"

"جناب' آپ نے کہاں رنگ کیا ہے؟"

"یہیں۔"

"تو یہ جوتوں کی دکان ہے سر۔"

"تمہارا سر۔ ہمیں دو کلو مٹھائی درکار ہے۔"

"تو مٹھائی کی دکان پر فون کریں۔"

"تم کیوں نہیں دے سکتے مٹھائی۔"

www.freepdfpost.blogspot.com

"یہ جوتوں کی دکان ہے میڈم۔ مٹھائی کی نہیں۔"

"ہمیں مٹھائی چاہئے جوتے نہیں مٹھائی۔ سمجھ نہیں سکتے۔ دماغ نہیں ہے۔"

"جہنم میں جایئے۔" اس نے ٹھک سے فون بند کر دیا۔ اور ہم دونوں ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو گئے۔

ایک دفعہ کسی کے گھر کا نمبر مل گیا۔ کوئی خاتون بولیں۔ "ہیلو کون؟"

"آپ کی موت۔" صائمہ نے کہا۔ "مروگی؟"

"موت آئے تمہیں۔ بدتمیز چھوکری۔" اس نے ان گنت گالیاں سنا کر فون بند کر دیا۔

"ایک بار شاید کسی بزرگ کا نمبر ڈائل ہو گیا۔ ڈانٹ ڈپٹ کے بجائے خلوص سے سمجھانے لگے کہ ایسا نہیں کرتے۔

بری بات ہے لوگوں کو خواہ مخواہ ذہنی کوفت دینا یا پریشان کرنا اچھی بات نہیں۔ ہم حیرت سے ان کا لیکچر سنتے رہے۔ پھر بولے۔ "بابا جی' اپنا فون ہی نکلوا دیجئے۔ ہم تو فون ضرور کریں گے۔

انہیں تاؤ آگیا' بولے اب تنگ کیا تو نمبر ٹریس کروا دوں گا سمجھیں۔"

"پھر کیا ہو گا؟"

"تمہارے باپ بھائی' شوہر کوئی تو ہو گا جس سے شکایت کروں گا۔"

"ہم کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ صائمہ بولی۔ "بابا جی۔ پہلے شوہر ڈھونڈ دیجئے۔ پھر نمبر ٹریس کر کے شکایت کر لیجئے گا۔"

"اس بابا جی نے بھی "بدتمیز" کہہ کر فون بند کر دیا۔

جوانی تھی' مستی تھی' شوق تھا۔ نشیب و فراز سے بے خبر ہو کر ہم یہ بے ضرر سی شرارتیں کرتے رہتے تھے۔ گھروں میں پھوٹ ڈلوانے کا بھی مشغلہ تھا۔ کبھی فون پہ بیوی آ جاتی تو خاوند کے متعلق اوٹ پٹانگ ہانک دیتے۔ کبھی خاوند سے بات ہوتی تو بیوی کے خلاف کان بھر دیتے۔ اور پھر تصور ہی تصور میں ان کی لڑائیوں کا مزہ لیتے۔ بعض اوقات تو نمبر نوٹ کر کے رکھ لیتے اور کچھ دنوں بعد احوال پرسی کرتے تو خوب گالیاں پڑتیں۔

ہم دونوں اکثر تک بندی سے کام لیتے۔ کوئی مرد اٹھاتا تو اس کی بیوی کا نام پوچھتے

عورت اٹھاتی تو شوہر کا۔ اکثر یوں بھی ہوتا کہ مرد شادی شدہ ہی نہ ہوتا۔ اور عورت بھی تاکتھا ہوتی۔ کوئی ہنس کر بات کا جواب دے دیتا اور کوئی فون یوں پٹختا کہ ہمیں لگتا ہمارے سر پر دے مارا ہے لیکن ہم باز نہ آتے۔

مجھے یاد ہے ایک بار ہم نے ایک شاہد درانی نامی نوجوان کو خوب بے وقوف بنایا تھا۔ بے وقوف بنانے کا ہم دونوں نے پلان پہلے سے بنایا تھا۔

ہم نے رنگ کیا۔ "کون بول رہا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"شاہد درانی۔"

میں نے صائمہ کے کان میں کھسر پھسر کی۔ فون اس نے مجھ سے لے لیا اور بولی۔" شاہد صاحب' آپ سے ایک سنجیدہ بات کرنی ہے۔"

"فرمایئے۔"

صائمہ سے میں نے فون چھین کر رازداری سے کہا۔

"آپ کی بیوی آس پاس تو نہیں ہیں۔"

"جی نہیں۔ وہ بچے کو لئے لان میں بیٹھی ہیں۔"

"تو پھر ٹھیک ہے۔ سنئے۔"

"جی فرمایئے۔"

"آپ ان ہی کی زبانی سنئے۔" میں نے صائمہ کو فون دے دیا۔

وہ اب خاصا پریشان لگ رہا تھا۔ صائمہ اوں آں کر رہی تھی۔ "دیکھئے نا صاحب' آپ بچے والے بھی ہیں۔"

"تو کیا ہوا؟"

"میں اب آپ کو کیا بتاؤں۔"

میں نے صائمہ سے فون لے کر کہا۔ "ہم آپ کو آپ کی بیوی کے کرتوتوں سے آگاہ کرنا چاہتے ہیں۔"

"جی؟" اس نے چیخ سی ماری۔ "کیا کہا۔"

میں اطمینان سے بولی۔ "آپ بہت سادہ ہیں۔۔۔ بیوی پر بہت اعتماد رکھتے ہیں۔ لیکن

www.freepdfpost.blogspot.com

یقین کریں' وہ اس قابل نہیں۔ وہ آپ کی غیر حاضری میں کیا کیا کرتی ہیں بتا نہیں سکتے' ہم۔"

کیا کہہ رہی ہیں' آپ ہیں کون؟"

"یہ بھی بتادیں گے پہلے مشورہ قبول کیجئے۔ بیوی کو سنبھالیئے۔"

صائمہ نے مجھ سے فون چھین کر رونی آواز بنا کر کہا۔ "میرے شوہر پر ڈورے ڈال ڈال کر میرا گھر برباد کر رہی ہے وہ۔ اور آپ کو خبر ہی نہیں۔"

وہ آدمی جتنا پریشان ہو رہا تھا' ہم اتنا ہی محظوظ ہو رہے تھے۔

"اس آدمی کا نام کیا ہے۔" آخر وہ غصے سے بولا۔

"یہ اپنی بیوی سے پوچھیں۔"

"یا خدا!"

"ہوش حواس بحال رکھیئے اور آنکھیں کھلی۔ ہمیں بس یہی کہنا تھا۔ باقی آپ جانیں اور آپ کی بیوی۔"

"ہم نے فون بند کر دیا۔ اور پھر دونوں خوب ہنسے۔ ہنس چکے تو ڈر بھی لگا کہ کہیں معاملہ سنجیدہ ہی نہ ہو جائے۔ لیکن ہم نے ڈر خوف ذہن سے جھٹک دیا۔

شادی ہو جانے تک میری یہ ہابی زور و شور سے جاری تھی۔ شادی کے بعد اپنی ہی مصروفیات ہو گئیں۔ لیکن تب بھی کبھی کبھار رانگ نمبر مجھ سے ڈائل ہو ہی جاتا اور میں کسی نہ کسی کو بے وقوف بنا ڈالتی۔ میں سجاد کو بھی بتا دیا کرتی تھی۔ پتا نہیں' یہ مذاق انہیں پسند تھا یا نہیں۔ لیکن مجھے انہوں نے روکا ٹوکا کبھی نہ تھا۔ میری یہی ہابی اب نمرہ کی ہابی تھی۔ اور چونکہ میں خود ایسی بے ضرر شرارتیں جوانی میں کیا کرتی تھی۔ اس لئے میں نے نمرہ کو بھی کبھی منع نہیں کیا تھا۔ اسی لئے جب وہ کوئی ایسا مذاق کر کے مجھے بتاتی۔ تو میں بھی اس سے خوب لطف لیتی۔

بات اچھی تھی یا بری لیکن یہ حقیقت تھی کہ نہ میں نے اور نہ ہی نمرہ نے اسے کبھی سنجیدہ لیا تھا۔ مذاق کرنے کا شوق تھا بس۔

لیکن سارہ نے آج۔ حیرت کی تھی تو مجھے سخت غصہ آیا تھا اور دکھ بھی ہوا تھا۔

میں مشین پر جھکی اپنی قمیض کی فٹنگ ٹھیک کر رہی تھی۔ آج سلائی کرنے کا موڈ بن گیا تھا۔ جمعدار صفائی کر کے جا چکا تھا۔ اور سکندر ڈسٹنگ کر کے فارغ ہو کر پچھلے لان میں مالی سے گپ شپ لگا رہا تھا۔ نمرہ اور حرہ اپنے کمرے میں تھیں۔

میں لاؤنج میں مشین لیے بیٹھی تھی۔ میں کام میں مصروف تھی یا وہی اتنی آہستگی سے اندر آئی تھی کہ مجھے پتا نہ چلا۔

جب وہ میرے قریب کرسی پر بیٹھتے ہوئے ہولے سے بولی۔ "سنعہ۔" تو میں نے سر اٹھا کر دیکھا۔

سارہ کو دیکھ کر مجھے کل کے واقعے کی تلخی نے پھر سے بدمزہ کر دیا۔ اسی لئے میں نے بڑی سرد مہری سے اس کے سلام کا جواب دیا۔ اور بے دلی سے کہا۔ "آپ آئیں اور مجھے پتا ہی نہ چلا۔"

وہ دونوں ہاتھ اپنی گود میں رکھے بیٹھی رہی۔ میری بات کا اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس نے کئی بار سر اٹھا کر مجھے دیکھا اور پھر سر جھکا لیا۔ غالباً وہ اپنے فعل پر شرمندہ تھی۔

میں بھی کچھ نہیں بولی۔ اپنی قمیض کو خواہ مخواہ ہی الٹ پلٹ کر دیکھنے لگی۔

"سنعہ۔" وہ کافی دیر کے بعد بڑے گلوگیر انداز میں بولی۔

میں نے جانے کیوں چونک کر اس کی طرف بڑے غور سے دیکھا۔ اس کا چہرہ ستا ہوا تھا اور اس کی خوبصورت سیاہ آنکھیں متورم تھیں۔

"سنعہ۔ میں کل کے واقعے پر معذرت خواہ ہوں۔" وہ رندھی رندھی آواز میں بولی۔

www.freepdfpost.blogspot.com

میں نے پھر چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ شرمندگی اور خفت اپنی جگہ۔ وہ تو اتنی دکھی، اتنی افسردہ اور ایسی پریشان تھی کہ میرا دل پسیج گیا۔

"مجھے یقیناً" بچی پر ہاتھ نہیں اٹھانا چاہئے تھا۔" وہ خود ہی اپنے دونوں ہاتھ بے تابی سے مسلتے ہوئے بولی۔ "مجھے کوئی حق نہ تھا لیکن..... لیکن..... میں بے اختیار ہو گئی تھی سنعہ۔ قطعاً" بے اختیار۔"

میں پھر بھی کچھ نہیں بولی۔

وہ اندر ہی اندر سسکیاں اتارتے ہوئے بولی۔ "مجھے معاف کر دو۔ میں نے بہت غلط کیا، لیکن میں کیا کروں..... میں فون..... پر..... ایسے....."

وہ بات پوری کئے بغیر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

میں حیران ہوئی۔ قمیص پرے رکھتے ہوئے میں نے دلی ہمدردی سے کہا۔ "سارہ کوئی بات نہیں ہمیں برا تو لگا تھا لیکن اتنا بھی نہیں کہ آپ یوں معذرت کریں۔ نمبر کا رانگ نمبر پہ کسی کو بے وقوف بنانا آپ کو برا لگا۔ تو....."

"سنعہ۔ تمہیں کیا بتاؤں۔ کیسے بتاؤں کہ میں فون گزیدہ ہوں۔ اس فون نے مجھے تباہ و برباد کر دیا۔ رانگ نمبر کے مذاق نے مجھے مار ڈالا۔"

وہ روتے ہوئے کہے جا رہی تھی۔

میرا دل جیسے تھم سا گیا۔

"سارہ۔ پلیز سارہ۔ چپ ہو جاؤ۔ مجھے پوری تفصیل سے بتاؤ۔ تم کیا کہہ رہی ہو۔ فون نے تمہیں کیوں کر تباہ و برباد کیا۔ پلیز..... سارہ میری اچھی بہن بتاؤ مجھے۔ میں کچھ نہیں سمجھ سکی۔" اور پھر سارہ نے مجھے اپنی وہ روداد پوری کی پوری سنا ڈالی۔ جسے میں سننے کی متمنی تھی اور جسے اس نے آج تک کسی کو نہ بتایا تھا۔

سارہ کی تباہی کی داستان زیادہ طویل تو نہ تھی۔ لیکن اسے سن کر میرے پاؤں تلے سے زمین سرک گئی۔

سارہ نے بتایا۔ "میں اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھی۔ شکل و صورت بھی خدا نے اچھی دی تھی۔ بی اے کا امتحان دیتے ہی رشتہ طے ہو گیا۔ امی دھوم دھام سے شادی کی

تیاریوں میں لگ گئیں۔ میں بھی بصد شوق اس میں حصہ لینے لگی۔ شادی ہو گئی۔ جیون ساتھی کا جو تصور میرے ذہن نے تراشا تھا، مجھے اس سے کچھ سوا ہی ملا۔ میں دنیا کی خوش قسمت ترین لڑکی تھی۔ جسے ٹوٹ کر چاہنے والا شوہر ملا تھا۔ گو وہ مالی طور پر مجھ سے کم تھا۔ شکل و صورت بھی واجبی تھی۔ لیکن پیار و محبت کا جو سمندر اس کے دل میں میرے لئے موجزن تھا میں اس کی گہرائیوں میں ڈوب کر رہ گئی۔ دن کہاں سے شروع ہوتا اور رات کہاں ختم ہوتی، کچھ احساس نہ تھا۔ احساس تھا تو صرف اتنا کہ وہ میرا ہے اور میں اس کی ہوں۔

وقت کے ساتھ ساتھ اس پیار میں اور شدت آتی گئی۔ یہ جذبات کی آندھی نہ تھی جو طوفانی صورت شادی کے وقت اٹھتی ہے اور پھر وقت کے ساتھ ساتھ معدوم ہو جاتی ہے۔ ایسا ٹوٹ کر چاہنے والا شوہر شاید ہی کسی بیوی کو ملا ہو۔ کبھی کبھی تو اس کی محبت کی تندی اور شدت سے میں گھبرا ہی جاتی۔ اور بے اختیارانہ پوچھتی۔ "تمہاری محبت میں یہ تندی اور تیزی برقرار رہے گی نا۔"

تو وہ مجھے بازوؤں میں بھر کر والہانہ انداز میں کہتا.....

"سارہ، وقت کے ساتھ ساتھ اس میں اضافہ ہی ہو گا۔.....

میں تمہاری طرف سے بھی ایسے ہی جوابی جذبات کا متمنی رہوں گا۔ کبھی ان میں کمی نہ آئے، سمجھیں۔"

"جو آ گئی تو....." میں ہنس کر چھیڑتی۔

"تو سمجھو، قیامت آ جائے گی۔"

"بہت خطرناک ارادے ہیں تمہارے۔"

"تمہاری والہانہ محبت ہی میری زندگی ہے۔ یہ نہ رہی تو میں مر جاؤں گا سارہ۔"

"خدا نہ کرے۔" میں اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیتی۔ اور مجھے اس کے بے پناہ پیار سے واقعی خوف محسوس ہونے لگتا۔

وقت اسی طرح رواں دواں رہا۔ ہماری محبت کا ثمر میری کوکھ میں مہکنے لگا۔ اسے پتا چلا تو وہ پہلے تو خوشی سے باؤلا سا ہو گیا۔ لیکن پھر ایک دم ہی سنجیدہ ہو کر بولا "سارہ یہ آنے والا ننھا منا مہمان میرا رقیب تو نہ بن جائے گا۔"

www.freepdfpost.blogspot.com

"کیسی باتیں کرتے ہو۔ اپنے بچے کے لئے ایسی باتیں۔"

"تم زیادہ توجہ اس کی طرف تو نہ دو گی۔"

"یہ تو وقت بتائے گا۔ اور میں یہ جانتی ہوں کہ تم بھی زیادہ وقت میری بجائے اسے ہی دو گے..... وہ ہمارے صحن چمن کا خوبصورت پھول ہو گا۔"

بچے کی پیدائش ہمارے لئے صدہا خوشیوں کا باعث تھی۔ امی نے تو اتنی خوشیاں منائیں کہ بیان سے باہر ہیں۔

وہ بھی بہت خوش تھے۔ جان چھڑکتے تھے۔ بچے پر۔ لیکن میں محسوس کرتی تھی۔ کہ جب میں منے کو پیار کرتی ہوں تو وہ کچھ برہم' کچھ ناراض سے ہو جاتے ہیں۔

ایک دن میں نے پوچھ ہی لیا۔ تو ہنس کر بولے۔ "سارہ' پتا نہیں کیوں۔ میں برداشت نہیں کر پاتا۔ کہ تم کسی اور کی طرف مجھ سے زیادہ متوجہ ہو۔"

"چاہے' وہ آپ کا اپنا بیٹا ہی کیوں نہ ہو۔" میں ہنس کر اترائی۔ تو وہ بڑی سنجیدگی سے بولے۔ "جب میں اپنے بیٹے کو اپنے مقابل نہیں دیکھ سکتا۔ تو کسی اور کا کیا سوال۔"

"بیٹا آپ کو بھی تو پیارا ہے۔ آپ بھی تو اس سے اتنا پیار کرتے ہیں۔"

"ہاں' کرتا ہوں۔ مجھے اعتراف ہے۔"

"میں تو اس بات کا برا نہیں مانتی۔ بلکہ خوش ہوتی ہوں۔"

"اس کا مطلب ہے' تمہیں مجھ سے اتنا پیار نہیں' جتنا مجھے تم سے ہے۔"

میں نے شوخی سے کہہ دیا۔ "شاید۔"

وہ اسی بات پر مجھ سے ناراض ہو گئے اور انہیں منانے کے لئے مجھے کیا کیا جتن کرنا پڑے' یہ میں ہی جانتی تھی۔

میں محسوس کر رہی تھی کہ روز بروز وہ میرے معاملے میں کچھ جنونی سے ہوتے جا رہے ہیں۔ وہ چاہتے کہ مجھے صرف اور صرف اپنی آنکھوں میں بسالیں۔ دوسرا کوئی میری طرف نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھے۔ میرے اپنے بھائی تو تھے نہیں' کزن کبھی کبھار آ جاتے اور میں ان سے ہنستی بولتی۔ تو ان کا موڈ آف ہو جاتا۔

ان کا پیار میری خوشی سے زیادہ کوفت کا باعث بنتا جا رہا تھا۔ اکیلا کہیں جانے آنے نہ

دیتے۔ جہاں جاتی' ساتھ جاتے۔ گھر میں ان کی غیر حاضری میں کسی کو آنے جانے کی اجازت نہ تھی۔ کوئی بھولے سے آ جاتا۔ تو طوفان اٹھ کھڑا ہوتا۔ کبھی کبھی میں بھی چڑ جاتی۔ لڑائی ہو جاتی۔ اور بگڑ کر کہتی۔ "پیار کے پردے میں آپ نے مجھے قید کر رکھا ہے۔"

وہ اس بات پر برا ماننے کے بجائے ہنس کر کہتے 'کیا یہ خوشی کی بات نہیں کہ تم میرے پیار کی قیدی ہو۔"

"آپ کچھ وہمی ہوتے جا رہے ہیں۔"

وہ برملا کہتے۔ "ہاں ڈرتا ہوں' تم مجھ سے چھن نہ جاؤ۔"

"اگر مر گئی تو کیا کرو گے؟"

"میں تمہیں مرنے نہیں دوں گا۔"

"ہر چیز پر جیسے آپ ہی کا اختیار ہے نا۔"

"تمہارے معاملے میں ضرور ہے۔"

یوں شب و روز کا چکر چلتا جا رہا تھا۔ نوک جھوک چھیڑ چھاڑ اور ہنسی مذاق کے ساتھ ساتھ کبھی کبھی لڑائی بھی ہو جاتی۔ یہی مجھے ازدواجی زندگی کا حسن لگتا۔

زاہد دو سال کا ہو گیا۔ تو میرا جی چاہا کہ میری آغوش پھر ننھے منے پھول سے مہکے۔ لیکن وہ اس بات پر آمادہ نہ تھے۔

"تم بچوں کی بھیڑ میں گم ہو جانا چاہتی ہو۔" بے تکے پن سے وہ کہتے اور میں پیار سے سمجھاتی' لیکن وہ تیار نہ ہوتے۔ "بس ایک ہی کافی ہے۔"

"مجھے بچوں کا بے حد شوق ہے۔" میں کہتی۔ "زاہد اب کھیلتا پھرتا ہے۔ اس کی ذمے داری اب مجھ پر زیادہ نہیں رہی۔ بچوں میں زیادہ وقفہ اچھا نہیں ہوتا۔ میں بور ہوتی رہتی ہوں۔ زاہد کی ایک بہن بھی ہونی چاہئے۔"

میں سمجھانے کی کوشش کرتی تو وہ بیزار ہو جاتے یا پھر ہنس کر کہتے۔ "میں زاہد پر ظلم نہیں کرنا چاہتا۔ جو مجھ پر ہو چکا ہے۔"

ان سب باتوں کے باوجود زندگی بڑے سکون اور مسرت سے گزر رہی تھی کہ اچانک ہی خوشیوں نے پلٹا کھایا۔ چاندنی اندھی ہو گئی اور میرا سب کچھ اندھیروں میں ڈوب گیا۔

www.freepdfpost.blogspot.com

وہ ایک شام تھی میں زاہد کے ساتھ لان میں تھی۔ وہ بھی تھے۔ ساڑھے تین سالہ زاہد گیند کے پیچھے بھاگ رہا تھا کہ ملازم نے آکر بتایا۔ "فون ہے جی۔"

"جائیے' دیکھئے۔" میں نے زاہد کی گیند پکڑ کر ہوا میں اچھالتے ہوئے کہا۔ تو وہ اٹھ کر اندر چلے گئے اور جب کافی دیر باہر نہ آئے تو میں پتا کرنے اندر آئی تو وہ فون ہی کے پاس دونوں ہاتھوں پر سر گرائے بیٹھے تھے۔

"کیا ہوا؟" میں نے بے طرح گھبرا کر ان کے ہاتھ پکڑ لئے۔

لیکن انہوں نے ایک بے رحم جھٹکے کے ساتھ مجھے پرے کیا اور خونی نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے اٹھ کر باہر چلے گئے۔

میں ششدر و حیران کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔

مجھے کچھ پتا نہیں تھا کہ کیا ہوا ہے۔ البتہ یہ پتا تھا کہ فون پر ہی کچھ ہوا ہے۔

کئی دن وہ بالکل پاگلوں کی طرح حرکتیں کرتے رہے' انہوں نے بیڈ روم کے بجائے گیسٹ روم کو مسکن بنا لیا۔ دفتر سے بھی چھٹی لے لی۔ کھانا پینا بھی جیسے حرام ہی کر لیا اپنے اوپر۔ بات اتنی سنجیدہ ہو گئی کہ میں پریشان ہو گئی۔ زبردستی کئی بار ان سے پوچھنے کی کوشش کی۔ لیکن وہ نہ کچھ بتاتے تھے' نہ ہی رویہ ٹھیک کرتے تھے۔ ہاں' مجھے خونخوار نظروں سے دیکھتے تو میرا دل ڈوب جاتا اور خوف کی کپکپی مجھ پر طاری ہو جاتی۔

لیکن میں بھی کب تک تذبذب میں مبتلا رہتی اور اندھیروں میں ٹکریں مارتی۔ سوچ سوچ کر دماغ ماؤف کرتی۔ ایک دن میں گیسٹ روم میں جا پہنچی۔ وہ آنکھیں بند کئے بیڈ پر چت پڑے تھے۔ صرف پاؤں عالم اضطراب میں مسلسل ہلا رہے تھے۔

"شاہد۔" میں نے بیڈ کے کنارے بیٹھ کر ان کا کندھا ہلایا۔ تو جیسے وہ بجلی کے ننگے تاروں سے چھو گئے۔ ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑے ہوئے۔

میں بھی آج پوچھنے کا فیصلہ کر کے آئی تھی۔ اس لئے بے خوفی سے ان کے سامنے ڈٹ کر کھڑی ہو گئی۔ اور تیز لہجے میں پوچھا۔ آخر ہوا کیا ہے؟ بتاتے کیوں نہیں کس کا فون تھا۔ کیا بات ہوئی ہے۔ مجھ سے کیوں چھپا رہے ہیں۔ خود پریشان ہیں اور مجھے کچھ بتا بھی نہیں رہے۔" میں کافی دیر غصے سے بولتی رہی۔ وہ مجھے گہری سرخ آنکھوں سے جن میں وحشت

بھری تھی گھورتے رہے

میں بے دم ہو کر چپ ہوئی تو وہ ایکا ایکی جیسے پھٹ پڑے۔ میری گردن پر ہاتھ رکھتے ہوئے غرائے۔ "بتا وہ کون ہے۔"

"کیا؟" میں سمجھی نہیں۔

"کون ہے وہ نام بتاؤ اس کا۔" وہ وحشی نظر آ رہے تھے۔

میں نے بمشکل اپنی گردن ان کی گرفت سے چھڑائی اور ہراساں ہو کر بولی۔ کس کا نام پوچھ رہے ہیں؟"

"وہی جس کے ساتھ رنگ رلیاں مناتی ہو۔" وہ چیخے اور مجھے یوں لگا جیسے چھت ساری کی ساری میرے سر پر آن گری ہو۔

میں صرف چلائی۔ "شاہد" اس چیخ سے یقیناً" گیسٹ روم کے در و بام گونج گئے تھے۔ لیکن شاہد درانی سینے پر ہاتھ باندھے ایک پتھر کی طرح بے حس کھڑا تھا۔

مجھ پر جنونی سی کیفیت طاری ہو گئی۔ میں بھوکی شیرنی کی طرح اس پر جھپٹی۔ "مجھ پر الزام لگا رہے ہیں آپ۔ تہمت۔ یہ ہمت۔"

لیکن میرے بڑھے ہوئے ہاتھ انہوں نے جھٹک دیئے میں نے چیخ چیخ کر کمرہ سر پر اٹھا لیا لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوا۔

اپنی بے گناہی کو ثابت کرنے کے لئے اس دن میں جو کچھ کر سکتی تھی کیا۔ لیکن شاہد پر کوئی اثر نہ ہوا۔ بلکہ سنگدلی سے بولا۔ "پاکھنڈ رچانے کی کوئی ضرورت نہیں۔"

"یہ شوشہ چھوڑا کس نے؟" میں روتے ہوئے چیخی۔"

"شوشہ۔" وہ تلخی سے بولا۔ "اتفاق ہی تھا جو اس دن فون میں نے اٹینڈ کر لیا۔ مجھے اس کی مظلوم بیوی نے رو رو کر بتایا۔ اس نے میری آنکھیں کھول دیں۔ ورنہ..... پتا نہیں میں کب تک تمہاری جیسی عورت کے ہاتھوں بے وقوف بنتا رہتا۔

میں نے گرمی سے' نرمی سے ہر طرح سے انہیں سمجھانے کی کوشش کی۔ "کسی کی شرارت ہے شاہد۔"

"کسی نے بے وقوف بنایا ہے۔"

www.freepdfpost.blogspot.com

"کسی حاسد نے فون کیا ہے۔"

"ہماری مثالی زندگی سے جلنے والے نے یہ آگ بھڑکائی ہے۔"

"اس میں ذرہ بھر بھی حقیقت نہیں۔"

"کسی دشمن کی لگائی بجھائی ہے۔"

لیکن میں رو رو کر' لڑ جھگڑ کر' منت سماجت کر کے۔ کسی طور بھی تو شاہد کو قائل نہ کر سکی۔ شک کی چنگاری بھڑک کر شعلہ بن گئی۔ جسنے میری زندگی کے ہر پہلو کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ شاہد درانی جیسا آدمی جو اپنے ہی بیٹے سے حسد و رقابت سے باز نہ آتا تھا۔ شک کو دل سے نکال بھی کیسے سکتا تھا۔

میں نے اپنے گھر کو' اپنی ازدواجی زندگی کو بچانے کی ہر ممکن کوشش کی۔

لیکن اندھے طوفان کی زد میں آیا ہوا گھر بچ سکا' نہ ازدواجی زندگی۔ چھ ماہ کی اذیت ناکیوں کے بعد میکے آ گئی۔ مصالحت کی کوئی صورت نہ رہی تھی۔

پھر شاہد درانی نے مجھے طلاق دے دی اور میرا بچہ بھی مجھ سے چھین لیا۔

سارہ ہچکیوں سے روتے ہوئے اپنی داستان غم سنا رہی تھی۔ روتے روتے ہی اس نے کہا۔ "میں نے اپنے اسی دکھ اور اذیت سے بے اختیار ہو کر نمرہ کو تھپڑ مارا تھا کہ اس کا بے ضرر سا مذاق کسی کا خرمن نہ جلا ڈالے۔ مجھے معاف....."

وہ کیا کہہ رہی تھی۔ شاید میں اب تک سمجھ نہ پا رہی تھی۔ میرا دماغ چکرا رہا تھا۔ مجھے برسوں پہلے کا واقعہ یاد آ رہا تھا۔ جب میں نے اپنی دوست کے ساتھ کسی شاہد درانی کو تختہ مشق بنایا تھا۔ اسی شاہد درانی کی کشتہ ستم سارہ میرے سامنے تباہی' بربادی اور ویرانی کا نشان بنی بیٹھی تھی۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ میرے اور صائمہ کے بے ضرر سے مذاق نے اسے تباہ و برباد کر دیا تھا۔

وہ شاید کل کے رویئے پر معذرت کر رہی تھی اور میرے حواس باختہ ہوئے جا رہے تھے۔ میں ایک دم چیخ اٹھی اور مٹھیاں بھر بھر کر اپنے بال کھینچنے لگی۔ پھر اٹھ کر میں نے فون کو زمین پر پٹخ دیا۔ میں پاگلوں کی سی حرکتیں کرنے لگی۔

سارہ گھبرا کر اٹھی اور مجھے بازوؤں میں بھر لیا۔ اور تسلی بھرے لہجے میں کہے گئی۔ میرا مقصد تمہیں پریشان کرنا نہیں تھا سنعہ۔ پتا نہیں کیوں' میں نے اپنی دکھی زندگی کے پرت تمہارے سامنے کھول دیئے' مجھے معاف کر دو۔ معاف کر دو۔"

لیکن مجھے ہوش ہی کب تھا۔ میرا نروس بریک ڈاؤن ہو گیا تھا۔ اور میں مہینہ بھر ہسپتال میں ایڈمٹ رہی۔

لیکن یہ اس جرم کی تلافی تھی' نہ مداوا جو مذاق کے پردے میں سرزد ہو چکا تھا۔

www.freepdfpost.blogspot.com

رانگ نمبر

گاڑی پورچ میں روک کر اس نے دروازہ کھولا۔ باہر نکلنے سے پہلے ہی گیارہ بارہ سالہ ملازم لڑکا چھینو لپکا۔ سلام کرتے ہوئے دوسرے سیٹ پر رکھا ہوا بریف کیس جو اس نے اٹھا لیا تھا' اس کے ہاتھ سے لے لیا۔ اس نے گیٹ میں داخل ہوتے ہی دیکھ لیا تھا کہ امی مالی کے ساتھ لان میں ہیں۔ وہ اس سے کیاریاں ٹھیک کرا رہی تھیں۔ پچھلے دنوں دو چار پارٹیاں اس لان میں ہوئی تھیں جس کی وجہ سے گھاس جگہ جگہ سے خراب ہو گئی تھی اور مہمان بچوں نے پھولوں کا بھی خوب ستیاناس مارا تھا۔

وہ گاڑی سے نکل کر ادھر ہی آ گیا۔ ماں کو سلام کیا۔ دوسرے سرے پر سفید کرسی پر بیٹھی اس کی خوش رو اور خوش مزاج بہن ثمرہ نے اسے دیکھتے ہی نعرہ لگایا۔ "اتنی دیر کر دی آج ظہیر بھائی....."

"کیوں؟" وہ خوش دلی سے بولا۔ "کوئی کام تھا؟"

"لبرٹی جانا تھا۔"

"گاڑی آ گئی ہے جا سکتی ہو۔"

"اکیلی؟"

"امی کے ساتھ چلی جاؤ....."

"اور میں جو آپ کے انتظار میں بیٹھی ہوں۔"

"میں نہیں جا سکتا۔"

"کیوں؟"

ظہیر کے جواب دینے سے پہلے ہی امی بولیں۔ "کیوں کا کیا مطلب' دیکھ نہیں رہیں' صبح کا گیا اب لوٹا ہے۔ تھکا ہوا ہو گا۔ تمہیں اپنی ہی پڑی رہتی ہے۔"

"ہائے امی۔ یہ ان کے تھکنے کی عمر ہے۔ ویسے بھی آج کل گھر میں فارغ ہی فارغ ہیں۔ لبرٹی لے جائیں گے تو کیا ہو گا۔"

"بس بس۔" امی نے سرزنشی لہجے میں کہا۔ پھر اپنے وجیہہ و شکیل بیٹے کی طرف پیار سے دیکھ کر بولیں۔ "جاؤ بیٹے۔ تم کپڑے وپڑے بدل کر چائے پیو۔"

"آپ نے پی لی؟"

"ہاں' کچھ مہمان آ گئے تھے۔"

ثمرہ اٹھ کر قریب آ گئی..... بولی۔ "اچھا شام کو لے جائیں گے۔ گھنٹا ڈیڑھ آرام فرما لیں۔"

"اچھا اچھا۔" ظہیر نے اس کا سر ہاتھ میں پکڑ کر ادھر ادھر پیار سے جھٹکا۔

"او' اللہ....." وہ چیخی۔

"اور ہاں بیٹے۔" امی کو جیسے کچھ یاد آ گیا۔ جلدی سے بولیں۔ "شہلا کا فون آیا تھا۔"

"کب؟" ظہیر' ثمرہ کو چھوڑ کر جلدی سے بولا..... "کیا کہا تھا؟"

"ابھی شاید پھر کرے گی۔ نہیں تو تم ہی کر لو۔ ٹھیک ٹھاک ہے۔ عدنان کی باتیں بتا رہی تھیں۔"

"وہ کیسا ہے.....؟"

"ٹھیک ہے۔"

"میں کرتا ہوں فون....."

وہ تیز تیز قدم اٹھائے اندر چل دیا۔ وہ لاؤنج میں بڑے سے شیشوں والی کھڑکی کے سامنے رکھے نرم و گداز صوفے پر بیٹھتے ہوئے اسنے کونے میں رکھی اونچی سے منقش تپائی پر رکھا فون اٹھا کر گود میں رکھ لیا۔ اور پاؤں درمیانی میز پر رکھتے ہوئے فون کرنے کے لئے ریسیور اٹھانے ہی والا تھا کہ فون کی گھنٹی بج اٹھی۔

"ہیلو۔" اس نے بے تابانہ انداز میں کہا۔

www.freepdfpost.blogspot.com

جواباً" ہیلو کی آواز آئی۔ آواز خاصی مدھم تھی۔ اس لئے اس نے دوبارہ کہا "ہیلو شہلا؟ شہلا ہو۔ میں ظہیر بول رہا ہوں شہلا..... ہیلو..... ہیلو....."

جواباً" بڑی کھنک دار ہنسی سنائی دی۔ یہ ہنسی بڑی ۔ تھی اور اتنی رسیلی اور کھنک دار تھی کہ اسے پوچھنا ہی پڑا۔

"ہیلو..... کون؟"

"ظہیر صاحب۔ میں شہلا نہیں ہوں..... مترنم سی آواز آئی۔ کوئی لڑکی بول رہی تھی۔

"اوہ..... اوہ سوری..... آپ کو کس سے بات کرنی ہے؟" وہ بولا

"آپ سے۔" انداز بڑا برجستہ تھا۔

"جی؟"

"گھبرا کیوں گئے؟" وہ ہلکا سا قہقہہ لگاتے ہوئے بولی۔

"جی گھبرانے کی تو کوئی بات نہیں۔ ویسے آپ ہیں کون؟"

"ایک لڑکی۔"

"وہ تو آواز بتا رہی ہے۔"

"پھر.....؟"

"پھر یہ کہ میں آپ سے باتیں کرنا چاہتی ہوں ظہیر صاحب۔"

"مجھ سے..... باتیں....."

"ہاں ہاں' آپ سے' اتفاق ہی سے آپ نے اپنا نام بتا دیا..... شکریہ....."

ظہیر چند لمحے چپ رہا۔ حیرانی سے فون کو تکتا رہا..... یہ کون تھی؟ آواز جانی پہچانی نہیں تھی۔ کوئی سر پھری سی لڑکی تھی۔

"ہاں تو ظہیر صاحب....."

"جی"

"آپ چپ کیوں ہو گئے تھے' باتیں کرنے میں کوئی ہرج ہے....."

"آں..... ہرج..... تو نہیں..... لیکن میں آپ کو نہیں جانتا۔ آپ مجھ سے باتیں کیوں کرنا چاہتی ہیں.....؟"

"تنگ کرنے کے لئے۔" وہ کھل کھلا کر ہنس پڑی۔

ظہیر کے لبوں پر بھی مسکراہٹ پھیل گئی۔ جلدی سے بولا۔ "بڑی صاف گو ہیں آپ۔"

"ہاں بالکل..... اور یہ بھی سن لیجئے۔ کہ کوئی ایسی ویسی لڑکی نہیں ہوں۔ بہت بور ہو رہی تھی۔ سوچا' کسی کو تنگ ہی کیا جائے۔"

"اور نمبر بھی ملائے.....؟"

"ہاں بھئی

ایک تو شاید کسی حلوائی نے اٹھایا....." وہ کھل کھلا کر ہنس پڑی۔

"پھر؟" ظہیر اس کی باتوں سے محفوظ ہو رہا تھا۔

"ایسی چپک چپک آواز تھی۔ جیسے شیرا انگلیوں سے لگ گیا ہو..... میں نے فٹ سے بند کر دیا۔"

ظہیر بے ساختہ ہنس پڑا۔

"سچی....." وہ بھی ہنسی۔

"پھر.....؟"

"ایک اور نمبر ملایا۔"

"وہ کس کا تھا؟"

"کسی ٹھیکے دار کا..... "ہیلو ہیلو" کہنے کے ساتھ ساتھ مزدوروں اور راجوں کا حساب بھی کر رہا تھا۔ فوراً بند کر دیا۔"

"پھر.....؟"

"تیسرا نمبر آپ کا ملایا۔"

"پھر یہ بند کیوں نہیں کیا؟"

"اس لئے کہ یہ آپ نے اٹھایا۔"

"میں نے۔"

"ہاں ظہیر صاحب نے۔""

www.freepdfpost.blogspot.com

PdfStuff.blogspot.com

"تو آپ میرے متعلق کیا جانتی ہیں۔ میں بھی کوئی نائی' دھوبی' قصائی ہو سکتا ہوں۔"

"اتنی انکساری بھی اچھی نہیں ہوتی۔ آپ پڑھے لکھے آدمی ہیں....."

"علم نجوم جانتی ہیں؟" وہ بھی قدرے شوخی سے بولا۔

"نہیں۔ بس آواز سے اندازہ ہو گیا ہے اور لہجے اور رویے سے بھی....."

"ہوں....."

"صرف ہوں"

"تو اور....."

"اس کا مطلب ہے' آپ بور ہونے لگے ہیں۔ بند کر دوں۔"

"آں..... نہیں..... آپ باتیں کرنا چاہتی ہیں نا..... تو کیجئے۔ کیا بات کرنا چاہتی ہیں؟"

"آپ کرتے کیا ہیں؟"

"صبر کرتا ہوں؟"

"ماشاء اللہ بہت اچھا کام کرتے ہیں۔ یہ بتایئے' مشاغل کیا ہیں آپ کے؟"

"آپ کون ہیں؟ میرا نام تو پتا چل گیا آپ کو اتفاق ہی سے..... اپنا تعارف بھی تو کروایئے۔"

"پھر کسی دن سہی....."

"تو گویا..... آپ پھر فون کرنے کا ارادہ رکھتی ہیں۔"

"اچھا نہیں لگا..... تو بس ختم..... آج ہی....."

"نہیں....." وہ جلدی سے بولا..... لڑکی کی باتیں دلچسپ تھیں۔ گپ شپ لگانے میں ہرج ہی کیا تھا۔ بوریت دور ہو گئی تھی۔ ورنہ آج سارا دن جس کیس کے سلسلے میں سر کھپانا پڑا تھا' وہ الجھا ہی ہوا تھا۔ دماغ تھک گیا تھا۔ اب وہ شگفتہ شگفتہ ہو رہا تھا۔ چھیڑ چھاڑ زبانی ہی تو تھی۔

وہ پھر بولا..... "ہیلو....."

"ہوں....."

"آپ کیا پوچھ رہی تھیں.....؟؟"

"آپ کے مشاغل....."

"آپ اپنے متعلق نہیں بتائیں گی؟"

"مجھے مارے گولی۔ آپ بتایئے۔"

وہ اس کی بات پر مسکرایا اور پھر شوخی سے بولا۔ "اپنے آپ سے اتنی بے زار کیوں ہیں؟"

"یہ کس نے کہا آپ سے؟" وہ جیسے غرائی۔

وہ ہنس پڑا۔ بولا "یہ گولی مارنے والی بات....."

"دیکھیں' آپ ٹرخانے کی کوشش مت کریں۔ یہ بتائیں کرتے کیا ہیں؟"

"جھک مارتا ہوں۔ سارا دن۔ یا آپ جیسی لڑکیوں کے فون....."

"ظہیر صاحب..... میں بند کرتی ہوں فون..... بتایئے ورنہ....."

"ورنہ کیا....."

"ریسیور آپ کے سر پر دے ماروں گی۔"

وہ بے اختیارانہ ہنس دیا۔ پھر بولا..... "آں بتاؤں کہ میں کیا کرتا ہوں.....؟"

"اور کیا بک بک کر رہی ہوں' یہی تو پوچھ رہی ہوں۔"

"میں..... میں انجینئرنگ کے آخری سال میں ہوں۔" ظہیر نے کچھ سوچ کر کہا۔

"گڈ..... گڈ۔" وہ جلدی سے بولی۔ "اچھی بات ہے۔"

"اس میں اچھی بات کیا ہے؟"

"مجھے بچوں سے باتیں کرنے میں مزہ نہیں آتا۔"

"کیا مطلب؟"

"بھئی' آپ بچے نہیں۔ یقیناً بائیس تیئس سال کے نوجوان ہیں۔" اس نے نوجوان پر زور دیا تو ظہیر بے اختیارانہ ہنس پڑا..... "خاصی ہوشیار ہیں۔"

"اچھا"

"ہاں۔"

"آپ کا نام ٹھیک بھی ہے کہ نہیں۔"

www.freepdfpost.blogspot.com

"ہوں' اچھا اب آپ بتایئے۔"

"کیا؟"

"اپنا نام.....وغیرہ وغیرہ....."

وہ جواب دینے کے بجائے کھل کھلا کر ہنس پڑی۔ اسکی ہنسی بڑی مترنم تھی۔ کانوں کو بے حد بھلی لگ رہی تھی۔

"فون بند کرتی ہوں۔" وہ ہنسی روک کر یک دم بولی۔

"نہیں کوئی زیادہ باتیں تو نہیں کیں آپنے.....؟" وہ جلدی سے بولا۔

"تنگ کرنا تھا' کرلیا....." وہ بے پروائی سے بولی۔

"لیکن.....میں تو تنگ نہیں ہو رہا....." ظہیر اس کی باتوں سے محفوظ ہو رہا تھا۔

"کمال ہے بھئی' جس بندے کو آپ جانتے نہیں' اس کو اس....." وہ بولی۔

"بندے نہیں بندی....." وہ ہنس کر بات کاٹتے ہوئے بولا۔

"چلئے بندی سہی....." وہ بولی۔

"بندی دلچسپ باتیں کر رہی ہے۔ بکواس نہیں....." وہ شوخ لہجے میں بولا۔

"ہوں"

"کیا؟"

"میاؤں۔" اس نے شوخی سے کہا تو ظہیر ہنس پڑا۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ کوئی جواب دیتا' پھر ایک بار میاؤں ہوئی اور اس نے کھٹ سے فون بند کر دیا۔

"ہیلو.....ہیلو ہیلو....." ظہیر نے آگے کو جھک کر ایک بار نہیں کئی بار کہا۔ فون پر بے ساختہ ہاتھ مارا لیکن فون بند ہو چکا تھا۔ ظہیر نے جھنجھلا کر فون رکھ دیا۔

لیکن پھر اسے اپنی جھنجلاہٹ پر ہنسی آگئی۔ صوفے کی پشت پر دونوں ہاتھ باندھ کر اس نے سر ان پر رکھ دیا.....اور تساہل سے میز پر پاؤں پھیلا دیئے۔ اس کے ذہن میں سریلی ہنسی اور کھنک دار آواز گونج رہی تھی۔ خاصی شوخ و شنگ لڑکی تھی۔

وہ چند لمحے اسی کے متعلق سوچتا رہا۔

پھر

"گولی مارو جی ظہیر صاحب!" اس نے دل ہی دل میں کہا اور سیدھے ہوتے ہوئے ملازم کو آواز دی۔ "بھئی چائے تو پلا دو۔ کب سے یا بیٹھا ہوں....."

"ابھی تک چائے بھی نہیں پی۔" ثمرہ اندر آتے ہوئے بولی۔

"کسی کو خیال تھوڑا ہی ہے ہمارا۔" اس نے شوخی سے بہن سے کہا۔ "لبریٰ جانے کا شوق ہے' اتنا نہیں ہو سکا کہ چائے بنوا کر بھائی کو پیش کی جائے' اپنے تھکے ہارے بھائی کے لئے چل جلدی سے چائے بنوا کے لا۔ میں کپڑے تبدیل کر لوں۔"

وہ اٹھ کر اپنے کمرے کی طرف چل دیا۔ ثمرہ باورچی خانے میں جا گھسی۔ لبریٰ لے جانے کے لئے ظہیر کو رام کرنا تھا۔ اس لئے چائے کے ساتھ شامی کباب اور پکوڑے تلنے لگی۔

PdfStuff.blogspot.com

www.freepdfpost.blogspot.com

فون کی گھنٹی بج رہی تھی۔ امی کے کچھ مہمان آئے تھے۔ وہ ڈرائنگ روم میں تھیں۔ ثمرہ شاید کچن میں تھی۔ ظہیر تیار ہو کر باہر جا رہا تھا۔ کسی دوست سے ملنے جانا تھا۔

ٹررن۔ ٹررن..... گھنٹی بج رہی تھی۔ جب کسی نے بھی فون نہ اٹھایا تو وہی کمرے سے لپک کر آیا..... اور فون اٹھالیا۔

"ہیلو۔" اس نے کہا۔

"ظہیر صاحب!" آواز آئی۔

"جی بول رہا ہوں۔" اس نے آواز نہیں پہچانی۔

"میں بھی بول رہی ہوں۔" وہ کھل کھلا کر ہنس پڑی۔

"اوہ آپ؟"

"جی میں۔"

"پہلے فون پر ہاتھ رکھ کر بات کر رہی تھیں؟"

احتیاطاً۔" وہ کھل کھلا کر ہنس پڑی۔ اس کی آواز میں وہی نغمگی اور ترنم تھا اور ہنسی بڑی کھنک دار تھی۔

"بڑے دنوں بعد فون کیا؟" ظہیر نے لاؤنج میں ادھر ادھر دیکھتے ہوئے ہولے سے کہا۔

"آواز دھیمی پڑ گئی؟" وہ بولی "کوئی اردگرد ہے؟"

آں..... فون لاؤنج میں پڑا ہے....."

"تو کمرے میں لے جایئے نا....."

"نہیں اس کی ضرورت نہیں۔"

"اس کا مطلب ہے' میدان صاف ہے....." وہ پھر ہنس پڑی۔

"یہی سمجھئے....."

"بھئی' بڑی مشکل پڑتی ہے مجھے بھی....."

"کیوں؟"

"گھر والے ادھر ادھر ہوں تو فون کر سکتی ہوں نا....."

"واقعی؟"

"تو اور کیا۔ بڑی جان جوکھوں کا کام ہے۔"

"اچھا۔"

"اور نہیں تو کیا....." وہ قدرے بگڑ کر بولی۔ "جب تک فون کرتی ہوں' جان حلق میں اٹکی رہتی ہے....."

"وہ ہنسا۔ "حلق میں؟"

"تو آپ کہیں اور اٹکا لیں۔" وہ ناراضگی سے بولی..... "اپنی جان ہے جہاں کہیں بھی اٹکا لیں۔"

"اوہو۔ ناراض کیوں ہو رہی ہیں..... معاف کر دیں بابا۔ بات تو کریں۔"

"چلو معاف کیا۔" وہ پھر ہنس دی۔ اور بولی "یہی ایک چیز ہے جس میں بہت سخی ہوں۔"

"گڈ۔ اچھی عادت ہے۔"

"اور ہر معاملے میں کنجوس ہوں۔"

"میں تو ہر معاملے میں سخی ہوں۔"

"چلو اچھی نبھے گی۔ ایک کنجوس اور ایک سخی۔"

وہ ہلکا سا قہقہہ لگائے بنا نہ رہ سکا۔

"کیوں جی! اس میں قہقہہ لگانے کی کون سی بات ہے؟" وہ غرائی

"ارادے خطرناک ہیں۔"

"کیوں؟"

www.freepdfpost.blogspot.com

"یہ جو نبھنے نبھانے کی باتیں کر رہی ہیں۔

"اے....." وہ غصے سے بولی۔ "دیکھو' میری کسی بات کو صحیح نہ سمجھ لینا سمجھے....."

"نہیں سمجھتا۔" وہ شوخی سے بولا۔

"کیوں؟"

"مرضی میری....."

"خاک آپ کی مرضی....."

"دیکھو بھئی' لڑنا نہیں۔"

"کیوں' میں کوئی لڑاکا ہوں؟"

"آج تو بات بات پر لڑنے کا موڈ ہے شاید....."

"آپ ایسی بات ہی کیوں کرتے ہیں۔"

"چلئے نہیں کرتا..... اب خوش؟"

"ہاں بالکل خوش۔"

"کیا کر رہی تھیں اس وقت؟"

"ظاہر ہے' بیکار بیٹھی تھی۔ اسی لئے فون لے بیٹھی۔"

"تو گویا بیکار وقت کا یہ مشغلہ ہے۔"

"تو اور کیا....."

"ہوں۔ اگر میں یہ کہوں کہ میں اس وقت بیکار نہیں تھا تو....."

"تو میں ابھی فون بند کر دیتی ہوں۔"

"نہیں....."

لیکن اس نے کوئی بات کئے بغیر ہی فون بند کر دیا..... ظہیر نے برا سا منہ بنایا۔ پھر فون کریڈل پر رکھتے ہوئے منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑایا..... ابھی نہ تو امی ادھر آئیں تھیں نہ ہی ثمرہ۔ اس لئے وہ کچھ دیر اور باتیں کر سکتا تھا۔ بڑے مزے مزے کی باتیں کرتی تھی نادہ..... الھڑ' اکھڑ اور شوخ و شنگ سی لڑکی تھی غالباً....."

"کم بخت۔" ظہیر مڑا..... اور دل ہی دل میں اسے کوستے ہوئے بولا۔ "پتا نہیں' اب

فون کرے گی بھی یا نہیں۔"

پھر

اس نے خود سے ہی کہا۔ "نہ ہی کرے تو اچھا ہے۔ خواہ مخواہ باتوں میں الجھالیتی ہے۔ بات بڑھنی نہیں چاہئے..... پتا نہیں کون بلا ہے..... جہنم میں جائے۔"

وہ الجھتا سلگتا باہر نکل گیا۔

پھر کئی دن اس کا فون نہیں آیا۔ پہلے تو وہ لاشعوری طور پر منتظر رہا۔ جب بھی فون کی گھنٹی بجتی۔ وہ فون کی طرف لپکتا۔ لیکن کبھی رانگ نمبر ہوتا۔ اور کبھی کسی دوست عزیز' امی کے ملنے والے اور ثمرہ ہی کی سہیلیوں کا فون ہوتا۔

وہ جب گھر آتا اس کا پہلا سوال یہی ہوتا..... "میرا کوئی فون تو نہیں آیا تھا؟"

جواب اکثر نفی میں ہوتا۔ کبھی کبھی امی اور ثمرہ نے اس کے فون کا نمبر نوٹ کیا ہوتا وہ کسی دوست یا کسی کلائنٹ کا فون ہوتا۔

ہفتہ بھر یونہی گزر گیا۔

اور

پھر اس رات جب وہ سونے کے لئے کمرے میں جانے والا تھا اور فون اٹھا کر لے جا رہا تھا۔ گھنٹی بج اٹھی۔ اسنے چلتے چلتے فون اٹھالیا۔

"ہیلو....."

"میاؤں۔" وہ کھل کھلا کر ہنس پڑی۔

"اچھا..... تو آپ ہیں....."

"شاید....."

"اتنے دن کہاں غائب رہیں؟"

"کیوں' انتظار کی زحمت سے دوچار ہونا پڑا.....؟"

"اگر کہوں..... نہیں تو.....؟"

"تو آپ کی مرضی..... ویسے جتنی بے تابی آپ کی آواز سے ظاہر ہوتی ہے' اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ کو انتظار تھا۔"

www.freepdfpost.blogspot.com

"اچھا تھا..... پھر....." وہ فون لئے اپنے کمرے میں آگیا۔ تار کو سلجھاتے ہوئے اس نے کہا۔

"پھر باتیں کرتے ہیں۔ میں نے امی ابو کے کمرے کا دروازہ بند کر دیا ہے اور فون اپنے کمرے میں لے آئی ہوں۔"

"میں بھی فون اپنے کمرے میں لے آیا ہوں۔"

"گڈ..... کیسا اچھا اتفاق ہے؟"

"تم خاصی ہوشیار ہو۔"

"دیکھو جی۔"

"کیا؟"

یہ آپ سے تم پر کیوں اتر آئے؟"

"بے تکلفی اچھی ہوتی ہے۔ پھر تمہاری آواز سے بھی تو لگتا ہے کہ تم مجھ سے چھوٹی ہو....."

"خوش فہمی میں نہ رہنا۔ تم سے بڑی بھی ہو سکتی ہوں۔"

"اب تم نے مجھے تم کیوں کہا.....؟"

"میری مرضی۔"

"اپنی مرضی دوسرے پر تھوپنے کی عادت ہے تمہیں....."

"کیوں نہ تھوپیں۔ رسی کا سرا میرے ہاتھ میں ہے۔"

"رسی.....؟"

"جی ہاں' فون کی رسی' جس سے آپ کو باندھ رکھا ہے۔"

"اوہو۔ کسی خوش فہمی میں نہ پڑنا۔ مجبوراً سن لیتا ہوں فون۔ بندھنے وندھنے کی پوزیشن میں نہیں ہوں میں....."

"بات کا بتنگڑ بنا لیتے ہو۔ نہیں بات کرنا چاہتے تو نہ سہی۔ میں ابھی فون بند کر دیتی ہوں۔ کر دوں؟"

وہ چپ رہا۔

"بولو نا۔ سانپ کیوں سونگھ گیا؟" وہ کھل کھلا کر ہنسی۔

"ہوں۔"

"بس ہوں؟"

"بھئی' واقعی رسی تمہارے ہاتھ میں ہی ہے۔ فون نمبر ہی بتا دو اپنا....."

"یہ غلطی میں کبھی نہیں کروں گی کہ رسی کا سرا تمہارے ہاتھ میں دے دوں۔"

"اچھا بھئی..... نہ کرو غلطی....."

"آں..... ایک بات بتاؤ....."

"کیا.....؟"

"تمہارے گھر میں کتنے لوگ ہیں؟"

"امی' ایک بہن اور دو نوکر..... اور آجکل یہاں کوئی نہیں۔"

"مختصر سا کنبہ ہے۔"

"اور تمہارا.....؟"

"بڑا وسیع و عریض۔" وہ پھر کھل کھلا کر ہنس پڑی۔

"اچھی بات ہے۔ خوب ہلا گلا اور رونق رہتی ہو گی۔"

"رہتی تو ہے۔ پر اس طرح فون کرنے کا موقع جو نہیں ملتا۔"

"نکالا کرو نا موقع۔"

وہ ہنس پڑی۔ "انتظار کرتے رہتے ہو نا' میرے فون کا..... سچ سچ بتاؤ....."

"کوئی خاص نہیں....."

"جھوٹے....."

"اچھا کرتا ہوں....."

"یہ ہوئی نا بات۔ یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ تم میرے فون کا انتظار نہ کرو۔"

"بس صرف انتظار ہی کرتا ہوں۔ مطلب کچھ نہیں ہوتا۔ وقت گزاری کے لئے..... باتیں اچھی کرتی ہو۔ اور تمہاری آواز بھی خوبصورت ہے۔"

"شکریہ..... پر یہ بتا دوں کہ صرف آواز ہی خوبصورت ہے؟"

www.freepdfpost.blogspot.com

"اور تم خود؟"

"کوئی بات کرو۔ نیند تو نہیں آ رہی....."

"ابھی نہیں..... ابھی تو میں نے ڈھیر سارا کام کرنا ہے۔ فائلیں کھولے بیٹھا ہوں۔"

"بند کردوں فون....."

"تمہاری مرضی..... لیکن میں ابھی بور نہیں ہوا۔"

وہ ہنس پڑی۔ "لیکن مجھے اب نیند آنے لگی ہے۔"

"تو سو جاؤ....." ظہیر نے کہا اور اسکا جواب سننے سے پہلے ہی بولا۔ "رکو..... شاید کوئی میرے کمرے میں آ رہا ہے..... اوہ ہاں، میں نے اپنی بہن سے چائے لانے کا کہا تھا وہ آ رہی ہے شاید..... اچھا بائے....."

"بہن سے ڈرتے ہو..... بزدل!" وہ کھل کھلاتے ہوئے بولی اور پھر بائے کہہ کر فون بند کر دیا۔

ثمرہ چائے لے کر اندر آ گئی۔

"کس کا فون تھا بھائی جان؟" ثمرہ چائے لے کر اندر آتے ہی بولی۔

"کوئی سر پھرا تنگ کر رہا تھا۔"

"بڑی لمبی بات ہو رہی تھی....."

"او..... ہاں..... باتیں دلچسپ کر رہا تھا۔"

"آزادی ہی آزادی ہے آج کل۔" ثمرہ نے آنکھیں مٹکاتے ہوئے شوخی سے اسے چھیڑا۔ "باتیں کوئی کر رہا تھا یا کر رہی تھی؟"

"چل شریر کہیں کی۔ لاؤ چائے، خود بنائی ہے نا؟"

"جی صاحب، اپنے ہاتھوں سے بنائی ہے۔ جناب پی کر دیکھئے....." ثمرہ نے اترا کر کہا۔ ظہیر کو اس کے ہاتھ کی چائے بہت اچھی لگتی تھی۔ اور وہ بھی بطور خاص بھائی کے لئے چائے بنایا کرتی تھی۔

کافی دنوں بعد اس کا فون آیا۔ اتفاق سے اس وقت ظہیر لاؤنج میں ہی تھا۔ اس کے ہاتھ میں میگزین تھا اور وہ چھٹی کے موڈ میں صوفے پر بڑے تساہل سے پڑا تھا۔ کچھ ہی دیر پہلے اس نے شہلا سے فون پر بات کی تھی۔ اس وقت آس پاس کوئی نہیں تھا۔ ظہیر نے گھنٹی بجنے پر فون اٹھایا..... وہ بول رہی تھی۔ آواز میں وہی کھنک، وہی جاندار سا لوچ اور وہی نغمگی تھی۔ وہ اس وقت فارغ تھی۔ اس لئے بڑی خوش دلی سے باتیں کر رہی تھی۔ ادھر ادھر کی باتیں جن کا سر تھا نہ پیر..... ظہیر محظوظ ہو رہا تھا۔

کافی دیر باتیں ہوتی رہیں۔

"اچھا..... اب بند کرتی ہوں۔" وہ بولی۔

"کیوں؟"

"پتا ہے، کتنے منٹ ہو گئے؟"

"میں تو گھڑی نہیں دیکھی۔"

"میں نے دیکھ رہی ہوں۔"

"کوٹہ ختم ہو گیا باتوں کا۔"

"یہی سمجھو..... زیادہ بک بک میں ہی کر رہی تھی۔ اب تم کرو۔"

"بک بک....."

وہ کھل کھلا کر ہنس پڑی۔

"اچھا بابا بس۔ اپنا نام تو بتا دو۔"

"یہ بات ہوئی..... نام بتاؤں نہ بتاؤں کیا فرق پڑتا ہے۔"

www.freepdfpost.blogspot.com
PdfStuff.blogspot.com

"میں جاننا چاہتا ہوں۔"

"نہیں بتاؤں تو....."

"تو میں ناراض ہو جاؤں گا....."

"ہو جاؤ۔ میرا کیا بگاڑ لو گے۔"

"بہت چالاک ہو تم....."

"شکریہ....."

"بتاؤ نا کیا نام ہے تمہارا....."

"کوئی بھی نام بتا دوں.....؟"

"اصلی بتاؤ....."

"جھوٹ بولوں تو۔"

"جھوٹ سے مجھے چڑ ہے۔"

"غلط....."

"کیسے؟"

"ایسے کہ تمہارا نام تو مجھے اتفاق سے ہی پتا چل گیا۔ لیکن تمہارا کام..... تم۔ بتایا ہو گا۔"

"چکروں میں نہیں ڈالو۔ نام نہیں بتاتیں تو یہی بتا دو کہ تمہارے مشاغل کیا پڑھتی ہو یا کہیں جاب کرتی ہو؟"

"بتا دوں..... سچ سچ..... بھئی..... میں۔"

"ہاں' ہاں۔"

"ایم۔ اے انگلش کر رہی ہوں میں۔" وہ شستہ انگریزی میں بولی تو ظہیر نے انگریزی ہی میں کہا۔ "انگلش میں کہنے کی ضرورت تھی....."

"ہاں' تمہیں یقین تو آ جائے نا....." وہ پھر اسی شستہ لہجے میں بولی۔ "بس اتنا ہی گی اور کچھ نہیں....."

"اپنا فون نمبر ہی بتا دو۔"

"نہیں 'قطعاً' نہیں۔ اور دیکھو ٹرینس کرنے کی کوشش بھی نہ کرنا۔"

"گھبراؤ نہیں۔ میں کوئی ایسا ویسا بندہ نہیں ہوں۔ بالکل ہارم لیس ہوں۔"

وہ بے اختیارانہ ہنس پڑی۔ پھر ایک دم ہی بول پڑی۔

"اچھا خدا حافظ..... پھر کروں گی فون۔" اسکے ساتھ ہی اس نے فون بند کر دیا۔

ظہیر باتیں کرنے کے موڈ میں تھا۔ اس لئے اسے جھلاہٹ ہوئی لیکن کیا کر سکتا تھا۔ فون بند کر دیا اور خود صوفے پر ہی نیم دراز ہو گیا۔ اس کی آواز کی بازگشت ذہن میں رہی۔ وہ کتنی ہی دیر اسی انداز میں پڑا رہا۔

پھر

اسے اپنے کسی کیس کا خیال آ گیا۔ بہت سا کام کرنا تھا ابھی۔ وہ اٹھتے ہوئے دل ہی دل میں اپنے آپکو کوسنے لگا۔ "کن چکروں میں پڑ گئے میاں' اپنے کام میں دھیان دو۔ یہ دل لگی کہیں مہنگی نہ پڑے۔ گولی مارو اسے۔ آئندہ فون آئے بھی تو بات نہ کرنا سمجھے....." وہ دل ہی دل میں اپنے آپ سے ہمکلام ہوتا صوفے سے اٹھا اور اپنے کمرے میں چلا گیا۔

www.freepdfpost.blogspot.com

PdfStuff.blogspot.com

فون کی گھنٹی بجی تو ظہیر کی امی نے ہاتھ بڑھا کر فون اٹھالیا۔

"ہیلو....." انہوں نے کہا لیکن دوسری طرف سے کوئی آواز نہ آئی۔ انہوں نے فون واپس رکھ دیا۔

وہ باہر چمن میں جا رہی تھیں۔ ابھی چند قدم ہی چلی تھیں کہ پھر گھنٹی بج اٹھی۔

"ہیلو" انہوں نے فون اٹھالیا۔

دوسری طرف سے آواز آئی۔ "ظہیر صاحب ہیں؟"

"ہاں جی ہیں۔ ہولڈ کریں' میں ابھی بلا کر لاتی ہوں۔"

"شکریہ۔" بڑے مہذب لہجے میں جواب ملا۔

امی ظہیر کے کمرے کی طرف مڑیں۔ وہ اس وقت کہیں جانے کے لئے تیار ہو رہا تھا۔ امی کو دیکھتے ہی بولا۔ "امی میں سلمان کی طرف جا رہا ہوں۔ اسی کیس کے سلسلے میں' دعا کریں یہ کیس....."

"تمہارا فون ہے بیٹے....." امی نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"سلمان ہی ہوگا۔" وہ بولا۔ "میں نکل ہی رہا ہوں۔"

"کسی خاتون کا ہے۔" امی مڑتے ہوئے بولیں۔

ظہیر چونکا۔ امی جاتے جاتے بولیں۔ "بات کر لو جا کر ہولڈ کیا ہوا ہے اس نے۔"

"اوہ۔" گھبراہٹ کے مارے اس کے ہاتھ سے برش چھوٹ گیا۔ امی مڑ چکی تھیں۔ دیکھا نہیں' ورنہ اس کی گھبراہٹ دیدنی تھی۔

وہ چند لمحے کھڑا رہا۔ فون پر بات کرے یا نہ کرے۔ کچھ دیر وہ یہی سوچتا رہا۔ پھر آہستہ

آہستہ چلتا کمرے سے باہر آگیا۔

امی باہر جا چکی تھیں۔

اس نے فون اٹھایا

"ہیلو۔"

دوسری طرف سے قہقہے کی پھوار پڑی۔

وہ

وہی تھی

"ہیلو۔" ظہیر نے پھر کہا۔ اس کی آواز دھیمی تھی۔

"لگتا ہے' جوتے نہیں تو ڈانٹ ضرور پڑی ہے۔"

"کیوں؟ کس سے پڑنا تھی؟"

"فون غالباً" تمہاری امی نے اٹھایا تھا.....؟"

"تو کیا ہوا....."

"اچھا..... پوچھا نہیں انہوں نے کس لڑکی کا فون ہے؟"

"کیوں پوچھتیں..... مجھے تو اکثر لڑکیوں کے فون آتے ہی رہتے ہیں۔"

"اچھا.....!" اس کی آواز میں حیرانی تھی۔

"ہاں۔" وہ اٹھلایا۔

"کتنی لڑکیوں کے فون آتے ہیں؟"

"بہت سوں کے۔"

"واہ جی۔ پھر تو بڑے ہیرو ہو۔"

"کچھ کم بھی نہیں۔"

"ملتے کتنی لڑکیوں سے ہو.....؟"

"بھئی بہت سی ہیں۔ جو فون پر ملتی ہیں' اور بہت سی ہیں جو....."

"جو....."

"اکثر ملتی رہتی ہیں....."

www.freepdfpost.blogspot.com

PdfStuff.blogspot.com

"بڑے خراب ہو۔ میرے خیال میں یہ فون کی دوستی ختم ہی کر دی جائے۔" اس کے لہجے میں ناراضگی تھی۔

"نہیں' نہیں بھئی..... یہ کیوں؟"

"بس..... مجھ سے دوستی کرنا ہے تو بس صرف مجھے ہی فون کیا کرو۔"

"بہت اچھا جناب۔ مان لیا۔ ویسے فون میں نہیں کرتا' آپ کرتی ہیں۔"

"میرا مطلب ہے' آئندہ صرف مجھ سے باتیں کرو گے تم۔"

"اچھا بھئی..... اچھا....."

وہ ہنس پڑی اور بولی۔ "میں مذاق کر رہی ہوں..... مجھے کیا جس سے مرضی ہو باتیں کرو۔"

"عجیب لڑکی ہو کبھی کچھ کہتی ہو کبھی کچھ۔"

"بس دیکھ لو۔" وہ اترائی۔

"دکھاؤ....."

وہ ہنس پڑی۔ "نہیں' دکھاؤ والی بات نہیں بس سن لو۔"

وہ بھی ہنس پڑا۔

"اچھا سنو....." وہ بولا۔ "ناراض تو نہیں ہو گئیں؟"

"کیوں بھلا.....؟"

"میں نے کہا جو تھا کہ مجھے بہت سی لڑکیوں کے فون آتے ہیں۔"

وہ ہنس پڑی۔ "یہ بات ہے ناراض ہونے والی۔"

"ہے بھی اور نہیں بھی۔"

"بس اب بند کرتی ہوں۔"

"کیوں؟"

"پھر کروں گی۔ کوئی آ رہا ہے خدا حافظ؟"

"خدا حافظ"

فون بند ہو گیا۔

پھر اس کا کوئی فون نہیں آیا۔ شروع شروع میں تو ظہیر غیر شعوری طور پر اس کے فون کا انتظار کرتا رہا۔ لیکن پھر کچھ کچھ بھول گیا۔ کسی شوخ لڑکی نے شرارت کی تھی۔ اسے اتنا سنجیدہ ہونا ضروری بھی نہ تھا۔ ویسے بھی وہ اپنے کام کے جھمیلوں میں پڑا ہوا تھا۔ اور فون کے معاملے میں سنجیدہ ہونا اس کے لئے ٹھیک بھی نہیں تھا۔ امی یا ثمرہ کو پتا چل جاتا تو شامت ہی آ جاتی۔ چند دنوں کی آزادی کا مطلب یہ تو نہیں تھا کہ وہ شتر بے مہار ہو جائے۔

لیکن ہفتے بھر کے وقفے کے بعد پھر اس کا فون آ گیا۔

"کیسے ہو؟" اسکی آواز بڑ شگفتہ تھی۔

"اتنے دن کہاں رہیں.....؟" وہ بے اختیارانہ کہہ اٹھا۔

"کیوں انتظار کرتے رہے؟"

"نہیں' ایسی بات تو نہیں تھی۔ دنیا میں اور بھی کام ہیں۔ صرف فون سننا ہی تو نہیں رہ گیا کام....."

"ناراض ہو گئے پکے پکے....." وہ کھل کھلائی۔

"بالکل نہیں۔"

"تو پھر اقرار کر لو کہ میرے فون کا انتظار تھا..... ہاں سنو۔" وہ اس کی بات کا انتظار کئے بغیر ہی بولی۔

"کیا؟"

"میرے خیال میں تم ٹھیک ہی کہہ رہے ہو۔" اس نے روٹھے سے لہجے میں کہا۔

"کیا؟"

"تمہیں واقعی میرے فون کا انتظار نہیں ہو گا اور لڑکیوں کے فون جو آتے رہتے ہیں۔"

وہ بے اختیارانہ ہنس پڑا..... "یہ منہ کیوں لٹکا لیا ہے ساتھ ہی۔"

"تم دیکھ سکتے ہو۔"

"محسوس کر رہا ہوں آواز سے۔ دراصل اور لڑکیوں سے فون پر باتیں کرنا تمہیں اچھا نہیں لگتا۔"

www.freepdfpost.blogspot.com

"مجھے کیا کیا کرو۔"

"بھئی نہیں کرتا کسی سے بھی سوائے تمہارے۔"

"سچ؟"

"میں جھوٹ نہیں بولتا۔"

"گڈ....."

"خوش؟"

"آں آں....."

"کیا؟"

"یہ مجھ سے رومانٹک ہونے کی کوشش تو نہیں کر رہے کہیں؟"

"کر تو رہا ہوں۔" اس نے ٹھنڈی آہ بھری۔

"غلط بات۔ میں ایسی ویسی لڑکی نہیں ہوں۔ میرے ساتھ ایکٹنگ نہیں چلے گی سمجھے۔"

"بہت چالاک ہو۔ صحیح پہچانا مجھے۔ میں ذرا دکھری ٹیپ کا بندہ ہوں۔" اس نے شوخی سے کہا۔

"کس سینس میں۔"

"اس میں کہ بعض اوقات مجھے کئی کئی لڑکیاں پسند آ جاتی ہیں اور بعض اوقات کوئی بھی اچھی نہیں لگتی....."

"واہ۔ بالکل میری طرح۔ کبھی تو مجھے یونیورسٹی کے سارے لڑکے اچھے لگنے لگتے ہیں اور کبھی سب ہی زہر لگتے ہیں۔"

"گڈ۔ پتا چل گیا۔"

"کیا؟"

"تم یونیورسٹی میں پڑھتی ہو۔" وہ بولا۔ "یونیورسٹی ہمارے گھر سے زیادہ دور نہیں۔"

وہ چپ رہی۔

"چپ کیوں ہو گئیں.....؟" وہ ہیلو ہیلو کرنے کے بعد بولا۔

"ادھر ہی ہوں۔" اس نے ہولے سے کہا..... اس کی آواز آئی تو وہ گہری سانس لیتے ہوئے بولا۔ "ڈر گئیں کہ کہیں میں یونیورسٹی نہ پہنچ جاؤں؟"

"ہاں جی' جو کسی دن بھولے سے میں اپنے ڈپارٹمنٹ کا نام بھی بتا بیٹھی تو دیکھوں گی کیسے نہیں آتے۔"

"سوری۔ میرے پاس فالتو وقت نہیں ہوتا۔"

"اچھا!" وہ اچھا کو قدرے کھینچتے ہوئے تمسخرانہ لہجے میں بولی۔ "اگر میں سچ سچ ہی بتا دوں تو نہ آؤ گے۔"

"آنے کا فائدہ؟"

"کیوں؟"

"مجھے کون سا تمہارا نام معلوم ہے کہ تمہارے ڈپارٹمنٹ کا پتا لے کر پہنچ جاؤں۔ ہزار تو لوگ ہوتے ہیں ہر ہر ڈپارٹمنٹ میں۔"

"ہاں....." وہ سوچنے کے انداز میں بولی..... "یہ تو ہے ایسا کرو....."

"کیا؟"

"آ ہی جاؤ' میں تمہیں دیکھوں تو ذرا....."

"فائدہ۔"

"ہر بات فائدے ہی کے لئے ہوتی ہے؟"

"کیوں نہیں۔ تم مجھے دیکھ لو۔ اور میں وہاں جھک ماروں نہ تمہارا نام پتا نہ حلیہ آ کر کیا کروں گا۔"

"بھئی کمال ہے' میں دیکھ لوں گی تمہیں..... مجھے پسند آ گئے تو پھر جگہ اور وقت مقرر کر لیں گے' تم بھی مجھ سے مل لینا۔"

"پسند تو میں آ ہی جاؤں گا۔ لاکھوں میں ایک ہوں....." وہ گھمنڈ سے بولا۔

"پھر تو آ جاؤ کسی دن....."

"اوں ہوں..... پہلے اپنا نام بتاؤ اور حلیہ بتاؤ۔"

"تم بچے نہیں ہو۔ اس لئے ضد نہیں کرو..... تو بس آ رہے ہو نا۔ یہ میرا حکم ہے اور

www.freepdfpost.blogspot.com

تمہیں ماننا پڑے گا....." وہ خود کھل کھلا کر ہنس پڑی۔ "لاکھوں میں ایک کو ایک نظر دیکھ تو لیں ہم۔"

"مذاق نہیں' میں ہوں ہی ایسا۔"

"اب تو ضرور ہی دیکھنا پڑے گا۔ ہاں تو آجاؤ کل ہی۔ گیارہ بجے ہمارا ٹیٹوریل پیریڈ ہو ہے۔ ایم۔ اے کے ہال میں وہیں آجانا۔ کوئی نہیں پوچھتا۔"

"اچھا محترمہ آبھی جاؤں تو تمہیں کیسے پتا چلے گا..... کہ میں..... ہوں....."

"یہ بھی ہے....." وہ بولی پھر چند لمحے کچھ سوچا اور تڑاخ سے بولی..... "سوچ لیا۔"

"کیا.....؟"

"جو کپڑے پہن کر آؤ گے' بتا دو۔"

"سوٹ ٹھیک رہے گا.....؟"

"کیا پتا..... لاکھوں میں ایک تو ہو تم..... ہر لباس سجتا ہو گا....."

"ٹھیک۔ پینٹ شرٹ میں آؤں گا۔ گرے پینٹ اور ریڈ شرٹ۔" وہ اسے اپنی شرٹ کے بارے میں بتانے لگا۔

"تو پھر طے رہا۔ میں انتظار کروں گی....."

"شرط یہ ہے کہ آئندہ پروگرام تمہارے ملنے کا ہو گا۔"

"بالکل....."

"پرامس"

"پرامس"

اس کے ساتھ ہی فون بند ہو گیا..... ظہیر سیٹی بجاتا ہوا لاؤنج سے باہر نکل گیا۔

جب میز پر سے گاڑی کی چابی اٹھائی تو چابی انگلی کے گرد گھماتے ہوئے وہ زیر لب مسکرا رہا تھا۔

"کیا ہرج ہے جانے میں شہزادہ گلفام تو ہوں ہی۔ دیکھ لے گی تو پچھتائے گی کہ یہاں انگور کھٹے ہیں والا معاملہ ہے..... جانا چاہئے..... دل لگی ہی تو ہے۔ مذاق' شرارت' شوخی ہو جائے۔"

وہ یہی سوچتا ہوا باہر نکل گیا۔

اور

تھوڑی ہی دیر بعد وہ گاڑی اڑائے یونیورسٹی کی طرف جا رہا تھا۔

گاڑی پارک کرتے وقت ایک بار پھر اس نے لوٹ جانے کا سوچا۔ کہیں اس نے بے وقوف ہی نہ بنایا ہو۔ ہال میں جانا کچھ اچھا نہیں لگا۔

لیکن اس کے بڑھے قدم رکے نہیں۔ وہ ہال میں پہنچ ہی گیا۔ وہ کچھ نروس بھی ہوا۔ لیکن اندر داخل ہو ہی گیا..... کوئی اسکی طرف متوجہ نہیں تھا۔ ہال میں خاصے لوگ تھے۔

اسٹوڈنٹس ٹولیاں بنائے خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ کوئی گروپ کرسیاں دائرے میں ڈالے بیٹھا مسائل پر بحث کر رہا تھا۔ کچھ لڑکے لڑکیاں کھڑکیوں کے قریب کھڑے بحث کر رہے تھے۔ کچھ ذاتی باتوں میں مصروف تھے۔ کسی کے ہاتھ میں کتابیں تھیں۔ کسی کے ہاتھ میں فائل۔ کوئی صرف بیگ پکڑے تھا۔ ہر کوئی مصروف گفتگو تھا۔ کچھ لڑکے لڑکیاں ہال سے باہر جا رہے تھے۔ اس کی طرف کوئی متوجہ نہیں تھا۔ لیکن اسے لگ رہا تھا۔ سبھی اسے دیکھ رہے ہیں۔ اب وہ خاصا پر اعتماد تھا۔ اور سنبھل سنبھلکر قدم رکھتے ہوئے آگے بڑھ رہا تھا۔ ہر لڑکی پر اسے فون والی لڑکی کا گمان ہو رہا تھا۔ لڑکیاں خاصی چنچل اور سمارٹ تھیں۔

ایک لڑکی اس کے قریب سے گزرتے ہوئے دوسرے لڑکی سے بولی۔ "نیو کمر....."

وہ رک گیا۔ دونوں لڑکیاں بھی رک گئیں۔ ایک لڑکی خاصی تیز اور شوخ تھی۔ دوسری سادہ سی تھے۔ اسے لگا' یہی فون والی لڑکی ہے۔ اس نے نیو کمر کی ہانگ لگائی تھے۔

"آپ نے کچھ کہا تھا۔" وہ شوخ لڑکی پر نگاہیں گاڑتے ہوئے بولا۔

"آپ نئے آئے ہیں۔" لڑکی بے تکلفی سے بولی۔ اس لڑکی کی آواز فون والی لڑکی سے قطعاً مشابہ نہیں تھی۔ اس لئے وہ نارمل انداز میں بولا۔ "جی نہیں۔ میں یہاں اپنے ایک

www.freepdfpost.blogspot.com

وہ قطعاً سنجیدہ نہیں تھا۔ پھر بھی تفریحاً یہ پروگرام برا نہیں تھا۔ اسی لئے دوسرے دن گیارہ بجے یونیورسٹی جانے کے لئے وہ تیار ہو رہا تھا اس نے لباس تبدیل کیا اور آئینے کے سامنے کھڑا دیر تک اپنے آپ کا جائزہ ناقدانہ انداز میں لیتا رہا..... پھر پرفیوم اسپرے کیا۔

"ٹھیک ٹھاک لگ رہا ہوں۔" اس نے زیر لب کہا۔

پھر

خود ہی مسکرانے لگا۔ "کتنا احمق ہوں میں بھی۔ کیا پتا اس نے مذاق اڑایا ہو میرا اور تیار ہو کر چل پڑا' جیسے مجنوں ہوں۔ ہوں..... لیکن فرق کیا پڑتا ہے۔ میں کون سا سیریس ہو رہا ہوں۔ مذاق ہے..... مذاق..... اسی حیلے میں یونیورسٹی ہو آؤں گا..... لیکن غلطی کی میں نے۔ اسے مجبور کرنا چاہئے تھا کہ اپنا لباس یا کوئی نشانی بتا دے۔ یہ تو بالکل بے وقوفوں کی بات ہے نہیں جانا چاہئے مجھے..... ہاں نہیں جانا چاہئے....."

وہ دھپ سے کرسی پر گر گیا۔

اور

تذبذب کے عالم میں پیر ہلاتے ہوئے سوچنے لگا..... اسے نہیں جانا چاہئے۔ یہ اسے زیب نہیں دیتا۔ جو کسی کو پتا چل گیا تو شامت آجائے گی۔

اس کی نظر میز پر پڑی شہلا کی تصویر پر پڑی۔ اور اس نے جانے کا ارادہ ترک کر دیا..... "آئندہ اس کا فون بھی اٹینڈ نہیں کروں گا۔" اس نے دل ہی دل میں کہا اور کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔

لیکن

دوست سے ملنے آیا ہوں۔"

لڑکیاں شاید پوری بات سنے بنا ہی آگے بڑھ گئیں۔ وہ چند قدم آگے بڑھا۔ ہال پر ایک طائرانہ سی نگاہ ڈالی۔ لڑکیوں کو خاص طور سے دیکھا لیکن کوئی بھی لڑکی اسے اپنی طرف انہماک اور توجہ سے دیکھتی نظر آئی۔

"آپ کسی کو ڈھونڈ رہے ہیں.....؟" اس کی پشت پر آنے والے نوجوان نے اسے یوں کھڑا دیکھ کر کہا۔

"اوہ..... ہاں جی....." وہ بوکھلایا۔

"کسے؟"

"اپنے دوست کو"

"کیا نام ہے اس کا میں ڈھونڈنے میں مدد کروں۔"

"ظہیر کوئی نام سوچ ہی رہا تھا کہ دو تین لڑکیاں اور لڑکے اس کے پاس آ کھڑے ہوئے۔

"کون ہیں یہ صاحب عدنان؟" انہوں نے پہلے سے کھڑے لڑکے سے پوچھا۔

ظہیر نرغے میں آنے سے پہلے ہی دروازے کیطرف دیکھ کر جلدی سے بولا۔ "وہ..... وہ جا رہا ہے۔ شکریہ۔ میں نے اسے ہی ملنا تھا۔"

بنا ان کی باتیں سنے وہ دروازے کی طرف لپکا۔ پھر جلدی سے ہال سے باہر نکل آیا۔ وہ سیدھا پارکنگ لاٹ کی طرف جا رہا تھا۔

"خواہ مخواہ شوخی میں آ گئے ظہیر صاحب۔" اس نے کھسیانے پن سے اپنے آپ سے کہا۔ "کچھ خیال ہی کر لیا ہوتا کہ یہ لچھن صحیح نہیں ہیں۔ ہوں..... فون پر چھیڑ خانی کیا ہوئی ہے کہ رشتے ہی باندھنے لگے ہیں۔ شرم کرو ظہیر..... تمہیں یہ باتیں زیب دیتی ہیں؟"

اس نے تہیہ کر لیا کہ آئندہ اس فون والی سے بات نہیں کرے گا۔ فون آیا تو کہہ دے گا کہ آئندہ وہ اس سے بات نہ کرے' خواہ مخواہ بات بڑھتی جا رہی تھی۔ اور بات کا بڑھنا کسی طور بھی مناسب نہیں تھا۔ وہ وہاں سے سیدھا اپنے ایک دوست کے ہاں گیا اور کافی دیر اس کے پاس رہا۔

www.freepdfpost.blogspot.com

اس نے مصمم ارادہ کر لیا تھا کہ اب فون نہیں سنے گا..... اسی لئے وہ سیدھا اپنے کمرے میں چلا گیا۔ ثمرہ کہیں سے آ گئی..... اس نے اپنی کسی سہیلی کے گھر جانا تھا۔

"بھائی جان' مجھے عاصمہ کے گھر ڈراپ کر آئیے۔"

"اچھا....."

"تیار ہو جاؤں؟"

"ہو جاؤ....."

وہ خوش ہو کر کمرے سے باہر نکل بھاگی۔ ظہیر کا ارادہ تھا کہ رات تک باہر وقت گزارے گا۔ تاکہ اس کا فون آئے تو سننا نہ پڑے۔

لیکن

نہ چاہتے ہوئے بھی اس کا من اندر سے چاہ رہا تھا کہ ایک بار اس کے منہ سے اپنے متعلق سن تو لے۔ آج اس نے اسے دیکھا تو ہو گا۔ بھلا کیا ریمارکس دیتی ہے۔ سن لینے میں ہرج تو نہیں۔ اس کا رات تک باہر رہنے کا ارادہ متزلزل ہو گیا اور وہ غیر شعوری طور پر فون کی بیل بجنے کا انتظار کرنے لگا۔ کیونکہ اسے اندازہ تھا کہ اب تک وہ یونیورسٹی سے گھر آ چکی ہو گی۔

چنانچہ جب ثمرہ تیار ہو کر آئی تو اس نے باہر جانے کا ارادہ ترک کر دیا۔ وہ بگڑی روٹھی غصے ہوئی۔ لیکن اس نے جانے سے انکار کر دیا۔ چابی اسے دیتے ہوئے کہا۔

"ظفری کو ساتھ لے جاؤ..... واپسی پر امی کو خالہ کے ہاں سے بھی لیتی آنا۔"

وہ بڑبڑ کرتی چل دی۔

اور

ظہیر میدان صاف دیکھ کر لاؤنج میں صوفے پر آ بیٹھا۔ جہاں اونچی منقش تپائی پر فون پڑا تھا۔ جب بھی فون کی گھنٹی بجتی اس کا ہاتھ بجلی کی سرعت سے اس طرف جاتا۔

پہلا فون عاصمہ ہی کا تھا وہ ثمرہ کا انتظار کر رہی تھی۔

پھر

چند منٹ بعد اس کے کسی دوست کا فون آ گیا چند منٹ گپ شپ رہی۔

پھر

کافی دیر وہ انتظار کی زحمت سے دوچار رہا۔ فون دم سادھے رہا۔ جب گھنٹی بجی تو اس نے بے تابی سے فون اٹھایا۔ "ہیلو" وہ بے صبری سے بولا۔

"ریحان بیکری۔" کرخت سی مردانہ آواز آئی۔

"رانگ نمبر....." جھلا کر اس نے فون دے مارا..... فون الٹ کر گرا۔ ظہیر نے ریسیور اٹھا کر کریڈل پر رکھنے کی زحمت ہی نہ کی۔ اسے اب بے اتنا کوفت ہو رہی تھی۔ اسکا فون آنا چاہئے تھا۔ اب تو شام اترنے والی تھی۔ یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ وہ ابھی تک گھر ہی نہ پہنچی ہو۔

کہیں جان بوجھ کر اس کے صبر کو آزما تو نہیں رہی۔ بڑی آئی۔ ایک دفعہ فون کر لے۔ پھر جو کبھی میں نے اس کا فون سنا تو..... خواہ مخواہ کی الجھن اونہہ..... وہ جز بز ہوتا رہا۔ فون تکتا رہا۔ اس نے اٹھایا نہیں۔

کئی منٹ بعد اسنے جھک کر فون اٹھایا اور جھلا کر کریڈل پر رکھ دیا۔ تب ہی گھنٹی بجی۔

"ہیلو....." وہ بیزاری سے بولا۔

"کہاں بات ہو رہی تھی اتنی لمبی....." دوسری طرف سے مدھر آواز آئی تو ظہیر اپنی مسکراہٹ نہ روک سکا۔

جلدی سے بولا۔ "کم بخت رانگ نمبر تھا۔"

"اچھا جی....." وہ غصیلے لہجے میں بولی۔ "اب میرے علاوہ دوسرے رانگ نمبر بھی آپ سے لمبی لمبی باتیں کرنے لگے ہیں....."

"توبہ میری..... ایک ہی بہت ہے۔" وہ شوخی سے بولا اب وہ خوش نظر آ رہا تھا۔

www.freepdfpost.blogspot.com

تجدد بہت دور ہو چکی تھی اور خوب چہک چہک کر باتیں کر رہا تھا۔

"اسلام میں تو چار جائز ہیں....." وہ تڑ سے بولی۔

"لگتا ہے' اس بات پر اب عمل کرنا ہی پڑے گا....." وہ بھی شوخی سے بولا۔

"توبہ توبہ.....! ارادے خطرناک ہیں تمہارے۔"

"تمہاری صحبت کا اثر ہے۔"

"میری صحبت؟"

"تو اور..... لگتا ہے تم نے اپنے امی ابو کی مشکل آسان کرنے ہی کے لئے فون کا سہارا لے رکھا ہے۔"

"کیا؟" وہ کیا کو لمبا کھینچتے ہوئے بولی۔ چند لمحے رکی اور پھر زوردار قہقہہ لگاتے ہوئے کہا "بھئی کیا کریں آج کل رشتے ملنا جو مشکل ہیں....."

"اسی لئے تو کہتا ہوں کہ مجھ سے مل لو۔" وہ شرارت سے بولا۔

"اتنی جلدی..... پہلے میں تربیت تو دے لوں۔" وہ تیز لہجے میں بولی۔

"کسے.....؟" وہ سمجھ نہیں سکا۔

"یہی کہ پہلے کس سے ملنا چاہئے؟"

"تو گویا اور بھی ہیں؟ کتنے ہیں؟"

"ٹھہرو..... گن لو....." وہ قہقہہ لگاتے ہوئے بولی۔

"ہو بڑی تیز....." وہ ہنسا۔

"اپنی بہنوں سے زیادہ نہیں....." وہ بسورتے ہوئے بولی۔

"کیا مطلب؟" وہ اب بھی کچھ نہ سمجھا۔

"بھئی' اپنی بہنوں کی طرح تیز ہوتی تو اب تک میری شادی بھی نہ ہو چکی ہوتی۔" وہ ہنستے ہوئے کہہ رہی تھی۔

وہ بھی ہنس دیا۔

"کتنی بہنیں ہیں تمہاری؟" اس نے قدرے توقف کے بعد پوچھا۔

"جتنے بھائی....." وہ اٹھلا کر بولی۔

"اور بھائی کتنے ہیں؟" اس نے خط اٹھاتے ہوئے پوچھا۔

"جتنی بہنیں....." وہ کھل کھلا کر ہنس پڑی..... یہ قہقہہ ظہیر کے کانوں میں رس گھول گیا۔

اب ذرا سیریس ہو جاؤ۔" ظہیر نے چند لمحوں کے بعد کہا۔

"کیوں؟" اپنے متعلق پوچھنے کی کھد بد ہو رہی ہے؟"

"ہاں۔" وہ جلدی سے بولا۔ "کیسا لگا تمہیں میں۔"

"ارے ہاں۔ یہ تو بتاؤ تم نے ٹائی الٹی کیوں پہنی ہوئی تھی۔" وہ چہکتے ہوئے بولی تو ظہیر سٹپٹا کر بولا۔

"نہیں تو۔ سیدھی ہی تھی۔ ڈیزائن ہی ایسا ہو گا۔"

وہ تڑاخ سے بولی۔ "بیوقوف بن گئے نا..... ٹائی تو تم نے پہنی ہی نہیں تھی۔ پینٹ شرٹ میں تھے۔"

وہ کھسیانا ہو کر ہنس پڑا۔ "ہاں پینٹ شرٹ ہی میں تھا۔"

"کیوں' اب تک بوکھلائے ہوئے ہو؟" وہ ہنس رہی تھی۔

"نہیں تو۔ بوکھلانے کا کیا سوال۔" سچ سننے پر وہ جھینپ گیا۔

"اوہو ناراض مت ہو۔ تعریف کر دیتی ہوں اچھے لگ رہے تھے۔"

"صرف اچھے....."

"بھئی بہت اچھے۔ ایک دم ہیرو۔ فسٹ کلاس۔ بس خوش....."

وہ واقعی خوش ہو گیا۔

"کیا یہ بھی کم ہے؟" وہ بولی۔

"بہت ہے شکریہ..... اب تم بتاؤ..... کب دیدار ہو گا کب ملو گی؟"

"ہیں..... بھول جاؤ..... بھئی۔ مجھے۔ بہت ڈرتی ہوں۔"

"میں نے کتنی بار کہا ہے' میں بے ضرر سا بندہ ہوں....." وہ اسے اپنے متعلق بتانے لگا۔ وہ سنتی رہی' پھر بولی۔

"نہ بھئی' میں تم سے ملی نا۔ تو بات بڑھ جائے گی۔"

www.freepdfpost.blogspot.com

"کیسے؟"

"ایسے کہ تم بار بار ملنے کی بات کرو گے' اصرار کرو گے۔ پھر' پھر....."

"پھر....."

"پھر ملاقاتیں بڑھیں گی۔ اور آہستہ آہستہ تم سنجیدگی سے مجھ پر عاشق ہونے لگو ے۔" وہ اتنے مضحکہ خیز انداز میں کہہ رہی تھی کہ ظہیر بے اختیارانہ ہنس پڑا۔

"سچ کہہ رہی ہوں۔ تم خواہ مخواہ کسی ناول یا افسانے کا ہیرو بننے کی کوشش کرو گے اور ب دن گریبان چاک کر کے کہو گے۔ لڑکی میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ بتا' کب یجوں اپنی اماں کو تمہاری ماں کے پاس تمہارا ہاتھ مانگنے کے لئے....." وہ زور شور سے ڈراما ل رہی تھی اور ظہیر کی ہنسی روکے نہ رک رہی تھی۔

"بہت دلچسپ ہو تم" وہ چپ ہوئی تو ظہیر نے ہنستے ہوئے کہا۔ "خیر تمہیں یقین دلا ں کہ نوبت یہاں تک نہیں پہنچے گی۔"

وہ جھٹ سے بولی۔ "تو پھر ملنے کا فائدہ۔ اصرار کیوں کر رہے ہو؟"

"ایسے ہی۔ ہر انسان میں تجسس کا مادہ تو ہوتا ہے۔ پھر جب تم نے مجھے دیکھ لیا ہے تو ب میرا بھی حق بنتا ہے۔"

"ایک بات بتا دوں پہلے سے۔" وہ کچھ سوچ کر بولی۔

"ہوں۔"

"میں کوئی حور پری نہیں ہوں۔"

"کوئی بات نہیں....."

"مجھے دیکھ کر تمہیں شاک لگے گا..... ایسا کہ پشتیں یاد رکھیں گی۔"

"کیوں..... کیوں کیوں؟"

"میں رات کو کالے کپڑے پہن لوں تو پتا نہیں چلتا' اندھیرا کہاں ختم ہوتا ہے اور میں ہاں سے شروع ہوتی ہوں۔"

ظہیر اس کی بات پر کھل کھلا کر ہنس دیا۔ "اتنی انکساری بھی اچھی نہیں۔"

"ذہن میں مجھے حور پری بنا رکھا ہے تو نکال دو یہ سب ذہن سے۔"

"بھئی تم جیسی بھی ہو۔ میں تم سے ملنا چاہوں گا اور ضرور ملوں گا۔"

"میرا خیال ہے' فون بند کریں اب۔"

"پہلے بتاؤ' کب اور کہاں مل سکتی ہو؟"

"کل رات نو بجے فون کروں گی۔ خدا حافظ! کوئی آ گیا ہے۔"

اس نے فون بند کر دیا۔

ظہیر نے فون رکھ دیا اور ایک زوردار انگڑائی لی..... وہ بے حد خوش نظر آ رہا تھا۔ لڑکی ں کے مردانہ حسن اور وجاہت سے مرعوب ہوئی تھی۔ خود ستائی انسان کی فطرت میں ہوتی ہے' وہ بھی انسان تھا..... نہ چاہتا تب بھی خوشی کا احساس اس کے اندر [illegible]

PdfStuff.blogspot.com

www.freepdfpost.blogspot.com

وہ کل رات نو بجے کا انتظار ابھی سے کرنے لگا۔

لیکن

اسے جھلاہٹ اور اذیت سے دوچار ہونا پڑا۔

یہ کل رات

تین چار دن گزرنے کے بعد بھی نہ آئی..... وہ ہر روز فون سرہانے رکھ کر سوتا کہ شا
رات کے کسی پہر اس کا فون آجائے۔

لیکن

انتظار کی کوفت و اذیت دور نہ ہوئی۔ کئی دن گزر گئے۔ وہ دل ہی دل میں ا
کوستا..... پھر اپنے آپ سے جھنجلاہٹ ہوتی۔ وہ خاصا چڑچڑا سا ہو گیا۔ اس کی شکایت
نے امی سے بھی کی۔

اور اس رات جب وہ اپنے ضروری کیس کی فائلیں دیکھ رہا تھا کہ فون کی گھنٹی
اٹھی۔

"ہیلو....." اس نے فون اٹھایا۔

"ہیلو....." دوسری طرف سے وہی البیلی اور شوخ و شنگ آواز آئی۔

"کون؟" وہ جان بوجھ کر انجان بنا۔

"ہائے ہائے..... پہچان ہی نہیں رہے جیسے۔" وہ ہنستے ہوئے بولی۔ پھر جیسے بچے
ڈانٹ دیتے ہیں' وہ بولی۔ "بات کرو سیدھی طرح..... میرے فون نہ کرنے سے ناراض
نا..... تو بھئی وجہ تو سنو پہلے۔"

"تم بہت جھوٹی ہو۔" وہ شاکی لہجے میں بولا۔

"جھوٹے تو تم بھی ہو..... پر خیر..... سناؤ کیسے ہو.....؟"

"تمہیں کیا؟"

"مجھے واقعی کچھ نہیں۔ بس فون کی دوستی کے ناتے احوال پرسی کر رہی ہوں۔"

"جہنم میں گئی دوستی....."

"اتنے چڑچڑے کیوں ہو رہے ہو۔ مار پڑی ہے امی سے.....؟" اس نے اس انداز سے
کہا کہ ظہیر کو ہنسی آگئی۔

"بہت خراب ہو۔" وہ بولا۔

"بہت اچھی ہوں۔" وہ اترائی۔

"تم نے دوسرے دن نو بجے رات فون کرنے کا وعدہ کا تھا....."

"جو ایفا نہ ہو سکا' سوری۔"

وہ کچھ دیر ادھر ادھر کی باتیں کرتی رہی۔ ظہیر محظوظ ہوتا رہا۔

"بہت ہو چکیں باتیں' اب کام کی بات کرو....." ظہیر نے کہا۔

"کیا؟"

"یاد ہے جو وعدہ کیا تھا....."

"تمہیں ملنے کا....."

"ہاں"

"اوہ..... رات گئی' بات گئی۔"

"قطعاً نہیں..... وعدہ کیا ہے تو نبھانا پڑے گا۔"

"وہ ہنس کر بولی۔ "ذرا گا کے سناؤ....."

"مذاق میں مت ٹالو....."

"میں سنجیدگی سے کہہ رہی ہوں۔"

"میں کہہ رہا ہوں' ٹالو نہیں بتاؤ کب اور کہاں ملو گی.....؟"

"جب چاہو فون پر....."

www.freepdfpost.blogspot.com

PdfStuff.blogspot.com

"پھر وہی ٹال مٹول۔"

"اچھا' اچھا بھئی غصہ تھوک دو..... سوچنے دو ذرا۔"

"سوچ لو....."

"آں..... ہاں..... بتاؤں.....؟"

"ہاں بتاؤ۔ سوچ لیا....."

"وہ تو اسی دن سوچ لیا تھا۔"

"بتایا کیوں نہیں.....؟"

"تمہارا صبر آزمانے کو..... اچھا تو یوں کرتے ہیں کہ کل..... کل برگر الیون میر ہیں....."

"لبرٹی میں.....؟"

"ہاں وہیں..... میں یونیورسٹی سے وہیں آ جاؤں گی۔ ڈیڑھ بجے۔ تم وہاں پہنچ ٹھیک....."

"ٹھیک۔ لیکن سچ کہہ رہی ہو نا....."

"کہتا ہوں سچ کہ جھوٹ کی عادت نہیں مجھے۔" وہ لٹک کر بولی۔

"وقت پر آ جاؤ گی نا.....؟"

"پانچ دس منٹ لیٹ ہو گئی تو خیر ہے نا..... اتنا مارجن تو دو گے نا....."

"لیکن اس سے زیادہ نہیں۔"

"بہتر....."

"اور ہاں..... مجھے تو تم پہچان ہی لو گی۔ میں تمہیں کیسے پہچانوں گا۔"

وہ کھل کھلا کر ہنس پڑی۔

"کیوں؟"

"بھئی میں نے تو تمہیں دیکھا ہوا ہی ہے جس میز پر تم ہو گے' میں وہیں آ جاؤں لیکن ایک بات!"

"کیا؟"

"شاک لگے گا مجھے دیکھ کر....."

"کوئی بات نہیں۔ فرق نہیں پڑے گا..... ہمارا افسانوں' ناولوں جیسا کوئی تعلق نہیں۔"

"اچھا..... اچھا زیادہ پارسا بننے کی کوشش نہ کرو....." وہ بگڑ گئی۔

ظہیر ہنس کر بولا۔ "پل میں تولہ پل میں ماشہ۔ خیر۔ کل ڈیڑھ بجے..... یاد رکھنا..... میر وقت پر پہنچ جاؤں گا۔"

"میں بھی کوشش کروں گی....."

"ٹھیک....."

"خدا حافظ۔"

"ابھی سے!"

"باقی کل ملنے پر۔ اوکے بائے۔" وہ ہنستے ہوئے بولی۔

"بائے۔" ظہیر نے بھی کہا۔

اس نے فون بند کر دیا اور ظہیر نے بھی فون رکھ دیا۔ اس نے سامنے کھلی فائلیں بند کر دیں۔ وہ کل کے تصور میں ڈوب گیا' کیس پر کام کرنا اب ممکن نہ تھا۔

PdfStuff.blogspot.com

www.freepdfpost.blogspot.com

ویٹر اس سے کافی عاجز آگیا تھا۔ وہ کچھ منگو' جو نہیں رہا تھا۔ ہر بار وہ پوچھنے آتا تو کہہ دیتا۔ "کوک لے آؤ۔"

وہ تین بوتلیں خالی کر چکا تھا۔

"کچھ کھائیں گے نہیں صاحب؟" ویٹر چوتھی بوتل لایا تو پوچھ لیا۔

"بھئی کہہ دیا ہے تمہیں۔ مجھے اپنے ساتھی کا انتظار ہے۔ اسکے آنے پر ہی کھانے کا آرڈر دوں گا....."

اس نے گھڑی دیکھی' تو اب تین بجنے والے تھے۔ ڈیڑھ بجے سے وہ یہاں بیٹھا اس کا انتظار کر رہا تھا۔

اس نے پھر گھڑی دیکھی۔ جھلا کر اس نے کوک پرے کر دی۔ اب تو انتہا ہو چکی تھی۔ اس نے یقیناً نہیں آنا تھا..... اسے بے وقوف بنایا تھا۔ وہ بھنا سا گیا اور غصے میں بھر گیا۔

اب تو ریسٹورنٹ میں زیادہ گہما گہمی بھی نہیں رہی تھی۔ اس نے ویٹر کو بلایا اور بل لانے کا کہا۔

"آپ کا ساتھی نہیں آیا سر۔" ویٹر زیر لب مسکراتے ہوئے بولا۔

"بل لاؤ....." وہ غرایا

ویٹر جلدی سے مڑ گیا۔

بل ادا کر کے وہ باہر نکل آیا۔

اسے سخت غصہ آ رہا تھا۔ اس پر بھی اور اپنے آپ پر بھی وہ بھنایا ہوا گاڑی میں بیٹھا۔ گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے وہ اس پر لعن طعن کرتے ہوئے اپنے آپ کو بھی کوس رہا

تھا۔

"خوب احمق بنے وکیل صاحب۔ اس الو کی پٹھی نے خوب تماشا لگایا آپ کا۔ اور آپ بھی..... سر پھرے عاشق بننے کے موڈ میں آ گئے۔ بھئی..... حد ہو گئی پاگل پن کی۔ وہ آپ کو الو بناتی رہی اور آپ زور و شور سے الو بنتے رہے۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ یہ بات آپ کو زیب نہیں دیتی۔ ظہیر صاحب' زیب نہیں دیتی آپکو....."

وہ سارا راستہ کبھی اپنے آپ کو کوستا اور کبھی اسے دل ہی دل میں گالیاں بکتا رہا۔ گھر پہنچا تو ذہنی کوفت سے اس کا موڈ خراب تھا۔

"ظہیر بیٹے....." لاؤنج میں داخل ہوتے ہی سامنے کھڑی امی نے پکارا..... تو وہ جلدی سے سلام کر کے بولا۔ "جی امی۔"

"آج شہلا آ رہی ہے ساڑھے نو بجے کی فلائٹ سے....." انہوں نے خوشی سے کہا۔

"سچ....." وہ سارا غصہ بھول کر جلدی سے بولا۔ "کب آیا فون؟"

"صبح....." امی بولیں' پھر ان کی آنکھوں میں پیار کی جوت جاگ اٹھی۔ جلدی سے بولیں۔ "میرا جانو آ رہا ہے۔ پورے ڈیڑھ ماہ بعد..... کتنی بے رونق تھی اس کے بغیر۔ تم تو سارا وقت اپنے کیسوں میں الجھے رہے۔ مجھے پوچھو کیسے گزارا ڈیڑھ ماہ عدنان کے بغیر۔"

ظہیر مسکرایا۔ "امی شہلا نے بھی اس دفعہ اتنی دیر لگا دی خواہ مخواہ۔"

"میری تو آنکھیں ترس گئی ہیں' خدا کا شکر ہے وہ آ رہی ہے۔ شہلا کے بغیر بھی گھر سونا ہی تو تھا۔"

"اچھا جی۔" ثمرہ کمرے سے نکل آئی۔ "تو ہم کسی گنتی ہی میں نہیں ہیں۔ امی کو بھو اور پوتا اتنا یاد آتے رہے اور ہمیں....." اس نے شوخی سے بھائی کی طرف دیکھا۔

ظہیر نے اس کے سر پر چپت لگائی۔ "بوریت تو تھی ہی نا ان کے بغیر....."

"تم تو مصروف رہے اپنے کیسوں میں....."

"امی' کیس بھی تو کرنا ہی تھے نا۔ ابھی مجھے وکیل بنے تین سال تو ہوئے ہیں۔ ابو کا نام نہ ہوتا تو اس فیلڈ میں قدم جمانے میں بہت دیر لگتی....."

"چلو اللہ کا احسان ہے۔ محنت کرتے رہو گے تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ ہاں اب تیار

www.freepdfpost.blogspot.com

ہو جاؤ۔ نہا دھو لو۔ وقت تھوڑا ہی ہے۔"

"امی' میں بھی چلوں گی ایئرپورٹ۔" ثمرہ نے کہا۔

"کیوں نہیں۔" وہ بولیں..... "تینوں چلیں گے۔ پارے پارے عدنی کو لینے....." امی بیحد خوش ہو رہی تھیں۔

ظہیر اپنے کمرے میں چلا گیا..... کوٹ اتار کر کرسی پر پھینکا اور بیڈ کے کنارے پر بیٹھ کر جھکتے ہوئے بوٹوں کے تسمے کھولنے لگا۔

اس کے ذہن سے غصہ اور جھنجلاہٹ دور ہو چکی تھی۔ عدنان اور شہلا کے تصور سے وہ خاصا مسرور نظر آ رہا تھا۔

سوا چار بجے کے قریب وہ تیار ہو کر لاؤنج میں آیا تو ثمرہ اور امی باہر جا چکی تھی۔ وہ بھی باہر نکلنے کو تھا کہ فون کی گھنٹی بجی۔ وہ لپک کر ادھر آیا۔ اسے جیسے یقین تھا کہ وہی ہو گی۔ وہی..... فون والی..... جو اس کا تمسخر اڑائے گی۔ ریسٹورنٹ نہ پہنچنے کی جھوٹی وجوہ بتائے گی۔

جھنجلا کر اس نے ہیلو کہا۔ اس کا خیال درست تھا۔ ادھر وہی تھی۔ ہنس کر کہہ رہی تھی۔

"ہیلو ظہیر صاحب کیسے ہو..... موڈ..... تو ٹھیک ہے؟"

ظہیر کا جی چاہا رانگ نمبر کہہ کر فون بند کر دے۔ لیکن جلد ہی اسے خیال آیا' آج اسے منع کر دے گا کہ آئندہ وہ اسے فون نہ کیا کرے۔ شہلا کے آنے پر وہ اس سے فونی رشتہ رکھنا نہیں چاہتا تھا۔

"ظہیر صاحب!" وہ بولی۔ "معذرت خواہ ہوں میں نہ آ سکی۔"

"اچھا کیا....." میں نے غصے سے کہا تو وہ حسب معمول کھل کھلا کر ہنس پڑی اور بولی۔

"اوہو۔ اتنا غصہ....."

"جی نہیں' کوئی غصہ نہیں۔ میں جلدی میں ہوں....." وہ بولا..... "کہئے....."

"کیسی جلدی۔" وہ اٹھلائی..... "دیکھو بھئی غصہ تھوک دو۔ میں نے کہا تھا نا' میں تم سے نہیں مل سکتی۔"

"توبہ ہے بھئی..... اصرار کر کے غلطی کی۔"

"اچھا۔" وہ ہنسی۔ "جو میں سچ مچ تمہیں ملنا چاہوں تو۔"

"تو میں نہیں ملنا چاہوں گا..... سوری....."

"اے ہے کیا ہو گیا ہے آج..... غصہ دور نہیں ہوا۔"

"وہ روکھے لہجے میں بولا۔ "کیا کہنا چاہتی ہو..... میں نے کہا نا' جلدی میں ہوں۔"

"اوہو۔" وہ تڑخ کر بولی۔ "روٹھے ہو..... جہنم میں جاؤ میں منانے تھوڑا لگ جاؤں گی..... میں نے تو فون کیا ہے' یہ بتانے کے لئے کہ آئندہ میں کبھی فون نہیں کروں گی۔"

ظہیر نے اطمینان کا سانس لیا اور بولا۔ "شکر ہے....."

"اونہہ اپنے آپ کو پتا نہیں کیا سمجھنے لگے ہو۔" وہ غصے سے بولی۔ "کوئی حور پرا..... اونہہ۔"

ظہیر کو اس کی بات پر ہنسی آ گئی..... لیکن سنجیدہ ہوتے ہوئے بولا..... "جو کچھ بھی ہوں۔ میں بھی یہی کہنے والا تھا کہ آئندہ فون نہیں کرنا مجھے....."

"مجھے بھی کوئی شوق نہیں تم سے باتیں کرنے کا۔ اور بے شک یقین نہ کرو۔ لیکن واقعی یہ میرا آخری فون ہے۔ سمجھے..... آئندہ کبھی فون نہیں کروں گی....."

"میں بھی یہی چاہتا ہوں۔ خدا حافظ....."

ظہیر نے اطمینان کا سانس لیا اور دل ہی دل میں دعا کی۔ "خدا کرے اس نے جو کچھ کہا ہے ٹھیک ہو۔ آئندہ اس کا فون نہ ہی آئے تو اچھا ہے۔"

www.freepdfpost.blogspot.com

اور

ادھر

وہ

فون کو گھور کر دانت پیستے ہوئے کہہ رہی تھی۔ "اب انتظار ہی کرتا رہے گا۔ کہ فون آئے۔ اونہہ۔"

پھر

اس نے پاس کھڑی اپنی تین سالہ پیاری سی بچی کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔ "چلو پنکی تیار ہو جائیں۔ وقت کم ہے۔" اس نے پنکی کو بازوؤں میں بھر کر اٹھایا اور پیار کرتے ہوئے بولی۔ "آج رات ہم پھر سے امریکا اڑ جائیں گے۔ اپنے نومی کے پاس پپا یاد آتے ہیں نا....."

پنکی نے ماں کے گال سے گال لگاتے ہوئے کہا۔ "اتنے بہت یاد آتے ہیں ماما....."

اس نے پنکی کے گال پر بوسہ دیتے ہوئے کہا۔ "میں بھی بور ہوتی تھی..... شکر ہے' ڈیڑھ مہینہ گزر گیا۔ اب مزے ہی مزے ہوں گے۔ نومی کو بتاؤں گی۔ میں نے یہ بوریت کیسے دور کی۔" وہ خود ہی کھل کھلا کر ہنس دی۔

پھر وہ بچی کو لپٹائے پیار کرتے اور گدگداتے ہوئے اپنے کمرے میں چلی گئی۔

قربانی

دوسری جنگ عظیم کی ہولناکیاں پوری شدت سے چار سُو پھیلی تھیں۔ پورا یورپ اس کی لپیٹ میں آچکا تھا۔ ملکوں کے ملک تباہی سے ہمکنار ہو چکے تھے۔ گھر اجڑ گئے تھے۔ لاکھوں فوجی جانوں کے نذرانے دے چکے تھے۔ عورتیں بیوہ اور بچے یتیم ہو چکے تھے۔ جنگ کا خوفناک آسیب خون کی ہولی کھیل رہا تھا۔

جرمن اور اتحادی دوبدو تھے۔

جنگ کئی سالوں پر محیط تھی۔ جرمن ایک طوفان کی صورت اٹھے تھے۔ تباہی اور بربادی کی بیشمار داستانیں رقم کی تھیں۔ لگتا تھا ان کے عروج کو زوال ہی نہیں آئے گا۔ لیکن جرمنوں کی طاقت چاروں طرف پھیلا دینے کی وجہ سے بکھر گئی تھی۔ سردیوں میں روس کے برفانی علاقوں پر چڑھائی انہیں توڑنے بکھیرنے کا سبب بنی تھی

اب جرمن سمٹ رہے تھے۔ پسپائی ہو رہی تھی۔ اتحادی فوجیں زور و شور سے انہیں پیچھے دھکیل کر مقبوضہ علاقے خالی کروا رہی تھیں۔

آخر میں تو جرمن اس طرح ٹوٹ پھوٹ گئے کہ اپنے ملک کی سرحدوں کے اندر سمٹ آئے۔ لڑائی اب بھی جاری تھی۔ جرمن ہار ماننے کو آمادہ اور تیار نہ تھا۔ ایک ایک قلعے میں ہزاروں فوجی قلعہ بند ہو کر لڑ رہے تھے۔ اور قلعوں کو بچانے کی جدوجہد کر رہے تھے۔ اتحادیوں کی ہر یلغار تباہ کن ہوئی تھی۔ پھر بھی جرمن ہائی کمانڈ لڑائی کا پلڑہ اپنے حق میں بھاری کرنے کی جدوجہد میں جانیں لڑا رہے تھے۔ ہر فوجی کو آرڈر تھا کہ وہ آخری وقت تک

www.freepdfpost.blogspot.com

ہتھیار نہ ڈالے۔ لڑتا رہے اور فتح حاصل کرے۔ اگر جیت نہ سکے تو بھی جیت کے لئے لڑتا ہوا جان دے دے۔

ہائی کمانڈ کے احکامات بڑے سخت اور بڑی حد تک وحشیانہ بھی تھے۔ زخمی شیر کچھ زیادہ ہی خونخوار ہو جاتا ہے۔ یہی بات جرمن ہائی کمانڈ کی تھی۔ حالانکہ دیکھنے والے دیکھ رہے تھے۔ کہ فتح و کامیابی ان سے منہ موڑ چکی ہے۔

فوجیوں کو ان احکامات کا علم تھا۔ اور وہ یہ بھی جانتے تھے۔ فرار ہونے یا ہتھیار ڈالنے کی صورت میں ان کے اہل خانہ کو موت کے گھاٹ اتار دیئے جانے کے بھی احکامات جاری کئے گئے ہیں۔ اس لئے کوئی فوجی اگر جنگ سے بھاگنے کی یا ہتھیار ڈالنے کی نیت کرتا بھی۔ تو اہل خانہ کے چہرے نگاہوں میں گھوم جاتے..... انہیں قتل کر دیا جانا تھا۔ اپنے پیاروں کی جانیں بچانے کے لئے ہی کئی فوجی جنگی محاذوں پر ڈٹے تھے۔ تخت یا تختہ والی بات ذہنوں میں سنبھالی تھی..... حالانکہ وہ جانتے تھے۔ کہ تخت تو حاصل کرنا ممکن نہیں..... لیکن تختہ انہیں ضرور مل جانا تھا۔

ان سخت ترین اور ظالم احکامات کی تشہیر اتنی کی گئی تھی۔ کہ جرمن کا بچہ بچہ اس سے آگاہ تھا۔ کچھ بھگوڑے سپاہیوں کے خاندانوں کا حشر بھی ہو چکا تھا۔ جس سے خوف و ہراس پھیل گیا تھا۔ اور جو فوجی بھی محاذ پر جاتا اس کے اہل خانہ رو رو کر اسے آخری دم تک لڑتے رہنے کی تاکید کرتے مائیں اور بچے جنگ کی صورت حال اور پٹتا ہوا پاسہ دیکھ کر مایوسی سے دو چار بھی ہوتے۔ لیکن اپنے فوجیوں کی ہمت افزائی اس لئے بھی کرتے کہ ایک جان کے بدلے خاندان بھر کی جانیں بچ سکیں۔

فوجی کمانڈ کے آرڈرز سے انحراف خود موت کو دعوت تھی۔ اہل دانش ہواؤں کا رخ دیکھ کر یقینی ناکامی سے آگاہ تھے۔ لیکن حکم کی خلاف ورزی کرنا ممکن نہ تھی۔

جنرل لاگ بھی ان میں سے ایک تھا۔ جو حالات و واقعات کو پلٹتے ہوئے دیکھ کر جانتا تھا۔ کہ اب ناکامی کو ٹالنا ممکن نہیں رہا۔

وہ دو دن کے لئے گھر آیا ہوا تھا۔

آتش دان میں آگ جل رہی تھی۔ اور وہ آرام سے کرسی پر نیم دراز وہ احکامات دیکھ

رہا تھا۔ جو ابھی ابھی ایک فوجی کپتان اسے دے کر گیا تھا..... وہ ابھی چھٹی کا پہلا دن ہی گزار پایا تھا۔ کہ اسے واپس بلا لیا گیا۔ قلعہ کی کمان اسے سونپی گئی تھی.....

سردی زوروں پر تھی۔ اور پچپن سالہ جنرل کی پینتالیس سالہ خوبصورت بیوی اس کے لئے کافی بنانے کچن میں گئی ہوئی تھی۔ دونوں ایک دوسرے سے بے پناہ محبت کرتے تھے۔ دنیا میں ان دونوں کا ایک دوسرے کے سوا کوئی قریبی عزیز تھا بھی نہیں۔ ان کی محبتوں کا ثمران کا ایک اکلوتا بیٹا الیگزینڈر تھا..... جو بچپن ہی میں ایک حادثے کا شکار ہو کر ان سے بچھڑ گیا تھا۔ الیگزینڈر کے پیدا ہوتے ہی جنرل کی بیوی سخت بیمار ہو گئی تھی۔ کچھ اندرونی خرابی کے ہو جانے سے ڈاکٹروں نے خدشہ ظاہر کیا تھا۔ کہ آئندہ وہ ماں نہیں بن سکے گی۔ یہ دھچکا تو تھا۔ لیکن دونوں ننھے الیگزینڈر کو پا کر ہی خوش تھے۔ یہی ان کی امنگوں کا محور اور امیدوں کا سہارا تھا۔

لیکن

جب وہ بھی ایک ناگہانی حادثے کا شکار ہو کر چل بسا۔ تو دونوں کی دنیا اندھیر ہو گئی..... اس بچے کی جدائی نے دونوں کو غم کے نالے سے اتنا قریب کر دیا۔ کہ دونوں ایک دوسرے پر جان نچھاور کرتے تھے..... دونوں کا پیار لازوال تھا۔ اور عمران کے ساتھ ساتھ یہ بھی بڑھتا جا رہا تھا۔ جنرل اور اس کی بیوی کے دوست احباب اکثر انہیں چھیڑتے۔ مذاق کرتے۔

لیکن

وہ دونوں اپنے پیار کے اظہار میں نہ تو بخل سے کام لیتے نہ ہی لوگوں کی باتوں پر کان دھرتے ان کا اپنا آپ تھا جو ایک دوسرے سے منسلک تھا۔ ایک دوسرے میں مدغم تھا۔ اور پھر پیار جوانی کے ابلتے مچلتے جذبوں ہی کا نام تو نہیں پیار تو ایسا جذبہ ہے جس میں عمر کی قید نہ ہے۔ نہ ہی شکل و صورت اور جسمانی ساخت کا کوئی تعلق ہے۔

دونوں دکھ سکھ کے ساتھی تھے۔ مزاج آشنا تھے۔ ایک دوسرے کے لئے قربانی کا جذبہ رکھتے تھے۔ ایک دوسرے کے آرام و آسائش کا خیال رکھتے تھے۔

چنانچہ جب بھی جنرل محاذ سے گھر آتا۔ اس کی بیوی کو جیسے نئی زندگی مل جاتی۔ وہ جتنی دیر گھر میں ٹھہرتا وہ اس کی خدمت میں پیش پیش رہتی۔ اس کے لئے اپنے ہاتھوں سے کھانا

www.freepdfpost.blogspot.com

بناتی۔ اس کے کپڑے دھوتی۔ استری کرتی..... اور جب وہ رخصت ہوتا تو اپنے غم اور دکھ اپنے اندر ہی اتار لیتی..... کبھی پرنم آنکھوں سے اسے وداع نہیں کیا۔ ہمیشہ لودیتی مسکراہٹوں ہی سے اسے رخصت کرتی۔

جنرل نے بھی ہمیشہ جدائی کا غم اس سے چھپایا تھا۔ کبھی احساس نہیں ہونے دیا۔ کہ وہ جنگ کے شعلوں میں کود کر بھسم بھی ہو سکتا ہے۔ دونوں جدا ہوتے تو پھر ملنے کی آس بڑی قوی ہوتی۔

آج بھی جنرل دو دن کے لئے جب آیا۔ تو اسکی بیوی کا چہرہ جگمگا اٹھا..... اس نے اپنے ہاتھوں سے اس کا پسندیدہ کھانا بنایا تھا۔ اور گھنٹوں اس سے باتیں کی تھیں۔ اب وہ اس کے لئے کافی بنا رہی تھی۔

اور

اس دوران فوجی افسر جنرل کے لئے نئے احکامات لے آیا تھا.....

جنرل آگ کے سامنے کرسی پر نیم دراز تھا۔ لیکن جوں ہی اس نے احکامات پڑھے وہ کرسی میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ پھر آگے کو جھک آیا۔ اس کی پیشانی پر بل پڑ گئے اور وہ خاصہ الجھا الجھا نظر آنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں سوچ و فکر کے سائے گہرے ہونے لگے۔ اس نے دوبارہ اپنے لئے جاری کردہ احکامات پڑھے۔

اسے فوراً واپس آنے کی تاکید کی گئی تھی۔ اور قلعہ بند ہو کر اتحادی فوجوں کا مقابلہ آخری دم تک کرنے کی تلقین بھی تھی۔.....

اس نے ایک جھٹکے سے کاغذات میز پر پھینکے.....

"کیا بات ہے" اس کی بیوی کافی کے دو مگ ٹرے میں رکھے اندر آگئی..... "تم پریشان ہو رہے ہو..... کوئی خاص بات..... لو کافی پیو..... میں تمہارے لئے کوئی اور چیز بناؤں.....

"رہنے دو" جنرل نے کاغذات کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "اب وقت ہی کتنا رہ گیا ہے۔ مجھے ابھی واپس جانا ہے۔"

"ابھی؟..... کہاں" وہ اس کے قدموں کے قریب ہی قالین پر بیٹھ گئی۔

جنرل جھلا کر بولا۔ "ہمارے بڑوں کے دماغ خراب ہو گئے ہیں....."

"کیوں کیا ہوا....." وہ جلدی سے بولی۔

"تمہیں اتحادی فوجوں کے متعلق تو میں نے تفصیل سے بتایا ہے نا..... وہ پوری قوت و لاقت سے حملے کر رہی ہیں....."

"ہاں یہ باتیں تم آج ہی مجھے بتا رہے تھے....."

"ہائی کمانڈ کا آرڈر ہے۔ کہ قلعہ بند ہو کر جنگ لڑی جائے۔

"تو....."

"تو..... تم خود سوچو کہ قلعہ بند ہو کر لڑائی لڑنے کا فیصلہ کتنا احمقانہ ہے۔" جنرل کی آواز میں جھنجلاہٹ تھی "آخر اس طرح کب تک مقابلہ کیا جا سکتا ہے۔ قلعہ بند ہو کر اتحادیوں کی یلغار کو روکنا؟ ہونہہ..... ہزاروں فوجی..... ہمارے حکام پاگل ہو گئے ہیں۔" جنرل نے مٹھیاں کرسی کی ہتھی پر مارتے ہوئے مایوسی سے کہا اپنے ہائی کمانڈ کو وہ احمق اور پاگل قرار دے رہا تھا۔

"ہزاروں فوجیوں کی جانیں داؤ پر لگائی جا رہی ہیں۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ اس طرح اتحادی فوجوں کی یلغار کو روکنا ممکن نہیں۔ نہ ہی عرصے تک لڑائی جاری رکھی جا سکتی ہے۔"

جنرل کی بیوی اس کے گھٹنے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولی۔ "تم صورتحال سے آگاہ ہو۔ اچھی طرح جانتے ہو کہ اس طرح لڑائی سوائے ہزاروں فوجیوں کی جانوں سے کھیلنے کے اور کچھ نہیں..... تو پھر تم احتجاج کیوں نہیں کرتے۔"

"احتجاج....." وہ تلخی سے بولا۔ "کیا تم نہیں جانتیں کہ یرغمالی کا اصول وضع کیا جا چکا ہے..... کوئی فوجی حکم عدولی نہیں کر سکتا..... ہائی کمانڈ کے فیصلے کے خلاف نہیں جا سکتا..... نہ ہی کوئی انکار کر سکتا ہے اور نہ ہی میدان چھوڑ کر بھاگ سکتا ہے.....

"ہاں مجھے پتہ ہے..... ایسی صورت پیدا ہو..... تو بھاگنے یا ہتھیار ڈالنے والے کے خاندان سے بازپرس ہوتی ہے اور انہیں بیدردی سے قتل کر دیا جاتا ہے....."

"جنرل اٹھ کھڑا ہوا..... اس کی بیوی بھی کھڑی ہو گئی..... اس نے بڑی محبت سے بیوی کے کندھوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "میرا اس دنیا میں تمہارے سوا اور کوئی نہیں..... سمجھیں....."

جنرل کی بیوی کے چہرے پر تاریکی سی لہرا گئی..... جنرل کی مایوس آواز نے اسے ہلا دیا

www.freepdfpost.blogspot.com

تھا۔ وہ جانتا تھا کہ یہ لڑائی جیتی نہیں جائے گی..... پھر بھی وہ اس مشن کا انچارج بنا دیا گیا تھا۔ ہزاروں فوجی بیرحمی سے مارے جائیں گے۔ قلعہ بند ہو کر لڑنا خودکشی کے مترادف تھا..... لیکن وہ احکامات کی خلاف ورزی نہیں کر سکتا تھا۔

"میرا سامان باندھ دو۔" جنرل نے جھنجھلائے ہوئے لہجے میں کہا۔

"وہ تو ابھی کھولا بھی نہیں ویسے ہی پڑا ہے۔" اسکی بیوی کی کوشش کے باوجود آواز ڈوب رہی تھی۔

"بس کوئی دم میں گاڑی مجھے لینے آئے گی۔" جنرل کمرے میں بے چینی سے ٹہلتے ہوئے بولا۔ وہ کمر کے پیچھے ہاتھ باندھے مضطربانہ ادھر سے ادھر ٹہل رہا تھا۔ بار بار سر جھٹک رہا تھا۔ اس کا ذہن ہائی کمانڈ کے احکامات کو قبول نہیں کر رہا تھا۔ یہ موت سے کھیلنے والی بات تھی۔ صرف ایک کی نہیں ہزاروں سپاہیوں کی موت تھی..... وہ اچھی طرح جانتا تھا۔

پھر

بھی

اسے جانا تھا۔ اس مشن کا چارج لینا تھا..... قلعہ بند ہو کر لڑائی لڑنا تھی۔ وہ اپنی بیوی کی زندگی کسی طور داؤ پر نہیں لگا سکتا تھا۔

وہ ٹہلتا رہا اس کی بیوی بھی خاموش تھی۔

وہ جب ٹہلتے ہوئے اسکے قریب آیا اور محبت بھری نگاہ بیوی پر ڈالی تو وہ بے اختیارانہ کہہ اٹھی۔ "اگر تم لوگ اتحادی حملہ روکنے میں ناکام ہو گئے..... تو....."

"حملہ روکنے میں ناکام کون ہو گا..... ہماری ہائی کمانڈ کا تو حکم ہے کہ آخری سپاہی تک جنگ لڑی جائے..... کسی صورت اتحادیوں کے سامنے ہتھیار نہ ڈالے جائیں....."

"اور..... اور....." اسکی بیوی کی اندیشوں بھری آواز ابھری۔ "تم جانتے ہو..... کہ ہائی کمانڈ کا فیصلہ احمقانہ ہے۔ ہزاروں فوجی موت کے گھاٹ جیسے دانستہ....."

"ہاں" جنرل اسکی بات کاٹتے ہوئے بولا..... "مگر مجھے ہائی کمانڈ کا حکم ماننا ہے....." وہ اپنی آواز میں زور پیدا کرتے ہوئے بولا۔

"مگر....." اس کی بیوی کانپ گئی۔

جنرل تلخی سے ہنسا اور بولا۔ "تم میری فکر کر رہی ہو..... جانم..... ہزاروں فوجیوں کی زندگی داؤ پر لگ رہی ہے....."

"تم لوگ جیت..... جاؤ گے۔" وہ اپنی آواز مضبوط بنانے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔

"دعا کرو....." جنرل نے یونہی کہہ دیا۔

"مجھے خط لکھتے رہنا..... صورتحال سے آگاہ کرتے رہنا....." اس کی بیوی نے پرنم آنکھوں سے اسے دیکھا.....

"صورت حال جو ہو گی اس کا تمہیں ابھی سے اندازہ ہے۔ تمہیں یوں بھی خبریں ملتی رہیں گی..... پھر بھی..... میں تمہیں جب تک ممکن ہوا خط لکھتا رہوں گا..... تم بھی..... لکھتی رہنا..... ہاں میرے متعلق....." جنرل کی آواز گھٹ گئی وہ کچھ کہہ نہ سکا۔

اور

جو وہ کہنا چاہتا تھا..... اس کی بیوی سمجھ گئی تھی.....

باہر گاڑی رکنے کی آواز آئی..... "لو وہ آ گئے....."

جنرل بیوی کے قریب آیا اسے بانہوں میں لے کر الوداعی الفاظ کہے..... تو بیوی کی آنکھیں نم ہو گئیں..... لیکن وہ اپنے شوہر کے جذبات سے آگاہ تھی..... اس لئے اس کی ہمت بندھانے کو بولی۔ "تم جیت جاؤ گے میرے جنرل..... تم زندہ رہو گے....."

وہ جلدی سے اسے الگ کرتے ہوئے اپنے سامان کی طرف بڑھا.....

اس کی بیوی نے سامان اٹھانے میں اس کی مدد کی۔

اور

جب اسے وہ الوداعی نظروں سے دیکھتے گاڑی میں جا بیٹھا..... اس کی بیوی نے اپنی آنکھ پونچھ لیں اور مسکراتے ہوئے اسے ہاتھ ہلایا.....

"تم زندہ..... رہو گے....." وہ جیپ کو چلتے ہوئے بولی۔

پھر

گاڑی نظروں سے اوجھل ہونے کے بعد وہ اندر لوٹ آئی.....

www.freepdfpost.blogspot.com

اتحادیوں کا یہ تیسرا حملہ تھا۔۔۔ اور پہلے دو حملوں کی طرح یہ بھی انتہائی شدید نوعیت کا تھا۔۔۔ پچھلے دو حملوں کے دوران اتحادی فوجوں کے چاک و چوبند دستے بڑی مہارت سے حملہ آور ہوئے تھے۔۔۔ اور کچھ دستوں نے قلعے کے پچھلی جانب دیوار میں شگاف بھی ڈال دیئے تھے۔۔۔ جنرل اس نازک اور تشویشناک صورت حال سے نپٹنے کی پوری کوشش کر رہا تھا۔۔۔ اس نے فوراً ہی ریزرو فوجی دستے ادھر بھجوا دیئے تھے۔ وقتی طور پر ادھر سے خطرہ ٹل گیا تھا۔ لیکن صورتحال بہت ہی تشویش ناک اور نازک تھی۔

اس وقت بھی اتحادی زوروں سے گولہ باری کر رہے تھے۔ اور جرمن فوجی جانوں پر کھیل کر ان کا حملہ پسپا کرنے کی کوشش میں لگے تھے۔

جنرل جنگی چالیں چل رہا تھا۔ جہاں تک ممکن تھا۔ وہ اسطرح صورتحال سے نپٹ رہا تھا کہ گمان ہوتا تھا۔ نہ تو اس کے پاس فوجیوں کی کمی ہے نہ ہی ایمیونیشن کی۔ حالانکہ حالات اس کے برعکس تھے۔

جنرل اس وقت بڑا مضطرب و بے چین تھا۔ وہ جنگ میں مصروف فوجیوں کو دیکھ رہا تھا۔۔۔ شیلنگ زوروں پر تھی۔ اس کے دیکھتے ہی دیکھتے دو تین زخمی تڑپے تھے اور ایک شیل ایک نوجوان فوجی کے سر کے پرخچے اڑا گیا تھا۔۔۔ اس شیل کی کرچیاں جنرل کی ٹانگ میں بھی آ کر لگیں۔۔۔ خون کی دھار بہہ نکلی۔۔۔ درد کی شدت سے جنرل کی آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا۔۔۔

شاید وہ کچھ دیر کے لئے بیہوش ہو گیا تھا۔

کیونکہ

جب اسے ہوش آیا تو اتحادیوں کا حملہ اختتام کو پہنچ چکا تھا۔ اس کے فوجی زخمیوں کو اکٹھا کرنے میں مصروف تھے۔ ہائے وائے کی پکار دل ہلا رہی تھی۔۔۔ کسی کی ٹانگ غائب تھی۔۔۔ کسی کا بازو اڑ چکا تھا۔۔۔ کسی کا آدھا چہرہ غائب تھا۔۔۔ اور کسی کا صرف دھڑ ہی رہ گیا تھا۔

جنرل کی ٹانگ میں سخت تکلیف تھی۔۔۔ وہ لڑکھڑاتے قدموں سے اپنے دفتر کی طرف بڑھ رہا تھا۔۔۔ جو عارضی طور پر قلعے کے جنوبی گوشے میں بنایا گیا تھا۔۔۔

راستے میں اس نے جگہ جگہ تڑپتے زخمیوں اور مرنے والے فوجیوں کی نعشیں دیکھیں۔ فوجی جوان زخمیوں کو اٹھا اٹھا کر لے جا رہے تھے۔۔۔ مرنے والوں کی لاشیں ادھر ہی پڑی تھیں۔۔۔ اس وقت ان کا کچھ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ نہ ہی کسی کے پاس وقت تھا نہ ہی جگہ کہ ان مرنے والوں کے کفن دفن کا انتظام ہو سکتا۔۔۔ ابھی تو پچھلے دو حملوں میں کام آنے والوں کی نعشیں بے گور و کفن پڑی سڑ رہی تھیں۔۔۔ آج ان کے لاشے اس طرح پڑے تھے۔۔۔ تو کون سی بڑی بات تھی۔۔۔ زخمیوں کے لئے بھی امدادی کیمپوں میں جگہ نہ تھی۔۔۔

اور

پھر

یہ بھی تو پتہ نہ تھا۔ کہ اتحادی اگلا حملہ کب کر دیں۔ وہ وقت دیئے بغیر حملہ آور ہو کر جرمنوں کی کمر ہمت توڑنے میں لگے ہوئے تھے۔

دو حملوں میں کام آنے والے فوجیوں کی لاشیں ڈھیر کی صورت میں قلعے میں ایک طرف لگا دی گئی تھیں۔۔۔ ان سے اب بدبو اٹھ رہی تھی۔۔۔ تعفن سے سانس گھٹ رہے تھے۔۔۔ سرانڈ ہوتی جا رہی تھی اور ارد گرد پھیل کر جیتے لوگوں کو سانس لینے تک میں وقت پیدا ہو رہی تھی۔

جنرل کو راستے میں کئی جگہ لاؤڈ سپیکر بھی پڑے نظر آئے۔۔۔ یہ اتحادیوں سے بری جرات اور مہارت سے قلعے کے اندر پھینکے تھے اور ان لاؤڈ سپیکروں سے وقفوں کے بعد اتحادی جرمنوں کو ہتھیار ڈال دینے کا کہہ رہے تھے۔

جنرل چند لمحے رک کر لاؤڈ سپیکروں کی آوازیں سننے لگا۔

www.freepdfpost.blogspot.com

اتحادی مسلسل جرمنوں کو ہتھیار ڈال دینے کی تلقین کر رہے تھے۔ مزید تباہی سے بچنے کا انہیں راستہ دکھا رہے تھے۔

سوچوں میں گم جنرل آگے بڑھ گیا۔

وہ دفتر میں داخل ہوا تو وہاں کماندار فلپ بیٹھا ہوا میز پر پڑی فائلیں دیکھ رہا تھا

"آؤ جنرل" فلپ اسے دیکھتے ہی اٹھ کھڑا ہوا۔

جنرل لڑکھڑاتا ہوا کرسی میں ڈھے گیا..... فلپ اس کی ٹانگ دیکھتے ہوئے جلدی سے بولا۔ "تم زخمی ہو گئے ہو؟"

"کچھ نہیں کچھ نہیں..... معمولی سی چوٹ ہے....." جنرل کے چہرے سے تکلیف ظاہر تھی۔

"میں فرسٹ ایڈ کا سامان منگواتا ہوں۔" فلپ جلدی سے باہر لپکنے کو تھا کہ جنرل نے ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے کہا "ٹھہرو فلپ....."

"کیا ہے جنرل....."

"ذرا کیپٹن روتھ کو تو بلا دو..... اسے کہو تمام رپورٹیں لے آئے۔"

"اچھا....." فلپ باہر نکل گیا۔

جنرل نے کرسی کی پشت پر سر ڈال کر آنکھیں بند کر لیں..... اس وقت وہ سخت جسمانی اور ذہنی اذیت میں مبتلا تھا۔

تھوڑی ہی دیر بعد فلپ واپس آیا..... تو اس کے ساتھ کیپٹن روتھ بھی تھا..... اس کے ہاتھ میں فائلیں تھیں۔

کیپٹن نے جنرل کو فوجی انداز میں سیلیوٹ کیا..... اور پھر مودبانہ انداز میں بولا۔ "رپورٹس حاضر ہیں....."

"سناؤ" جنرل نے کرسی میں بیٹھے بیٹھے آرڈر دیا۔

"پہلی رپورٹ ایمیونیشن انچارج کی ہے سر....." وہ بولا..... "اس رپورٹ کے مطابق اس کے پاس اسلحے اور گولہ بارود کا ذخیرہ ختم ہو رہا ہے۔ بلٹس کی تعداد تو نہ ہونے کے برابر ہے..... اسلحہ تیزی سے ختم ہو رہا ہے..... یہی صورتحال رہی تو شاید اگلے حملے کے

ہمارے پاس لڑنے کو ایمیونیشن قسم کی کوئی چیز ہی نہ ہو....."

"کیپٹن روتھ نے پہلی رپورٹ ختم کرنے کے بعد جنرل کی طرف دیکھا۔

"ہوں....." جنرل سوچوں میں مستغرق تھا۔

"دوسری رپورٹ ڈاکٹر ولسن کی ہے سر....." وہ بولا۔

"پڑھو....." جنرل نے کہا۔ "شروع کرو....."

کیپٹن روتھ نے پہلی فائل میز پر رکھ کر دوسری فائل کھولی..... اس رپورٹ کے مطابق ہسپتال اور امدادی کیمپوں میں دوائیاں ختم ہو رہی تھیں۔ ویکسینز تو بالکل ختم تھیں..... زخمیوں کے آپریشن نہیں کئے جا رہے تھے..... ان کی تعداد بھی بہت زیادہ تھی۔ دوائیوں کے نہ ہونے سے ان کی حالت تشویشناک تھی..... بیڈ بھی میسر نہ تھے۔ اکثر زخمی ننگی زمین پر ہی پڑے تھے۔ اس کے علاوہ لاشوں سے اٹھنے والی سرانڈ کا بھی مسئلہ تھا..... ان کا بھی کچھ کرنا ضروری تھا..... ورنہ کوئی خوفناک وبا پھیل سکتی تھی۔ یہ اندیشہ ڈاکٹر ولسن نے زور دے کر ظاہر کیا ہوا تھا۔

روتھ نے دوری رپورٹ ختم کی اور جنرل کی طرف دیکھے بغیر تیسری رپورٹ پڑھنے لگا۔ یہ رپورٹ کیپٹن ایڈورڈ نے بھجوائی تھی.....

"انہوں نے اپنا ریزرو دستہ واپس منگوایا ہے سر۔" کیپٹن روتھ مودبانہ انداز میں بولا۔

"کیسا دستہ....." جنرل انتہائی تلخی سے بولا اس کی آنکھوں میں ہیجانی کیفیت تھی۔ وہ بڑے طنزیہ لہجے میں بولا۔ "ریزرو دستہ..... ہونہہ..... اس میں سے اب بیرے اور چند خانسامے ہی بچے ہیں....."

"آگے پڑھو۔" چند لمحے مضطربانہ انداز میں کرسی میں پہلو بدلنے کے بعد جنرل نے کہا۔

"کیپٹن روتھ نے رپورٹ پڑھی..... جس میں بتایا گیا تھا۔ کہ راشن کا ذخیرہ ختم ہو رہا ہے..... بہت کم اناج رہ گیا ہے۔ فوجیوں کی تعداد کے لحاظ سے یہ دو دن بھی نہیں چل سکتا.....

جنرل چپ رہا.....

"اور سر" کافی دیر خاموش رہنے کے بعد کیپٹن روتھ نے کہا۔

www.freepdfpost.blogspot.com

"ہوں" جنرل کے منہ سے صرف یہی آواز نکلی۔

"اور یہ رپورٹ ان دو سپاہیوں کے متعلق ہے سر..... جو پچھلے حملے میں فرار ہو گئے تھے انہیں آج صبح گرفتار کر لیا گیا ہے..... ان کے بارے میں آپ کے احکامات کا انتظار ہے۔

"یہ دو سپاہی" فلپ نے مداخلت کی..... "حملے کے دوران بھاگ گئے تھے نا....."

"جی" روتھ نے کہا۔

"ان کی سزا....." جنرل سوالیہ نظروں سے روتھ کو تک رہا تھا۔

"ظاہر ہے سر ان کے سر قلم کر دیئے جائیں گے....." روتھ سپاٹ لہجے میں بولا۔

"قتل....." جنرل بڑبڑایا.....

"یس سر..... روتھ نے کہا..... "یہ ہائی کمانڈ کے آرڈرز ہیں..... یہ نہ بھی ملتے تو بھی سزا تو ہونا تھی ان کے خاندان والوں سے باز پرس ہوتی..... وہ بھی ان کے متعلق کچھ نہ بتا سکتے..... تو انہیں موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا....."

"ہوں....."

"سر یہ ایک لحاظ سے ٹھیک ہی ہے۔ یہ دو سپاہیوں کے لئے عبرت کا باعث ہے....." روتھ بولا..... "کوئی فوجی بھاگنے یا ہتھیار ڈالنے کی جرات تو نہیں کرے گا نا....."

"ہوں۔" جنرل نے آنکھیں بند کر لیں۔ اس کے چہرے پر شدید تشنج کی کیفیت تھی.....

"ان کے متعلق حکم" روتھ منتظر تھا۔

"ٹھیک ہے کل ان کا فیصلہ سنا دیا جائے گا۔" جنرل نے کہا۔ فلپ نے سوالیہ نظروں سے جنرل کو دیکھا..... شاید جنرل کی بات اسے پسند نہ آئی تھی۔ اس کے چہرے پر ناگواری کی شکنیں تھیں۔

روتھ رپورٹیں سنا کر سیدھا کھڑا ہو گیا۔

"تم جا سکتے ہو۔" جنرل نے کہا۔

روتھ سیلوٹ کر کے کمرے سے نکل گیا۔

جنرل نے اسے جاتے نہیں دیکھا۔ بس اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔

"کیا..... کیا جائے....." وہ بڑبڑایا۔ فلپ بھی کچھ متوحش نظر آ رہا تھا.....

صورت حال سنگین ترین حدوں کو چھو چکی تھی۔ اب ہر چیز ہاتھ سے نکل رہی تھی۔ ایسی صورتحال سے نبرد آزما ہونا ان کے بس میں نہیں تھا۔ وہ اب کسی طور بھی اس قابل نہ تھے کہ اتحادیوں کے حملے کا مقابلہ کر سکتے۔

"میں تو پہلے ہی کہتا تھا کہ ہائی کمانڈ کا یہ فیصلہ انتہائی بچگانہ ہے۔" جنرل چلا اٹھا۔

کمانڈر فلپ نے چونک کر اسے دیکھا۔ پھر آہستگی سے بولا..... "وہ تو ٹھیک ہے جنرل۔ لیکن اب ہمیں آگے کی سوچنا ہے....."

"اب کیا رہ گیا ہے سوچنے کو....." جنرل جیسے ہذیانی کیفیت میں مبتلا تھا۔ "صورت حال ہمارے قابو میں نہیں رہی..... اتحادی آج نہیں تو کل پھر بھرپور حملہ کریں گے..... کیا ہم ان کا مقابلہ کر سکتے ہیں؟....."

"نہیں....." فلپ بھی پورے زور سے بولا..... "نہیں کر سکتے..... پھر کیا کریں۔ جنرل بتاؤ پھر کیا کریں....."

جنرل نے بے بسی سے سر ادھر ادھر پٹخا..... پھر بے بسی سے بولا۔ "ہم یہ جنگ نہیں جیت سکتے"

کمانڈر..... جنگ جاری رکھنا..... ہزاروں فوجیوں کی ہلاکت کے سوا ہمیں کچھ نہیں ملے گا۔ سوچو۔ ہزاروں فوجیوں کی زندگی کا سوال ہے....."

فلپ خاموشی سے کرسی پر گرنے کے انداز میں بیٹھ گیا۔

"ہم یہ جنگ جیت نہیں سکتے..... لڑنے کا کیا فائدہ..... سوچو فلپ..... سوچو ذرا..... ہزاروں فوجیوں کے قتل سے بہتر ہے کہ ہم شکست تسلیم کر لیں۔ ہتھیار ڈال دیں....." جنرل اپنی رو میں بولے جا رہا تھا۔ وہ آنے والی خوفناک تباہی کو دیکھ رہا تھا۔ ہزاروں گھر تباہ ہو سکتے تھے۔ عورتیں بیوہ اور بچے یتیم..... کیا سب کچھ جانتے ہوئے بھی جنگ جاری رکھنا ضروری تھی؟

"ہتھیار ڈال کر ہم نہتے لوگوں کو بچا سکتے ہیں فلپ سوچو....." سوچو فلپ۔" وہ بے حد جذباتی ہو رہا تھا۔ فلپ اس کا منہ تکے جا رہا تھا..... بے شک جنرل ٹھیک کہہ رہا تھا۔

لیکن

www.freepdfpost.blogspot.com

ہائی کمان کے آرڈرز.....

جنرل بولے جا رہا تھا..... فلپ کا ذہن بھی مفلوج ہو رہا تھا..... جب اس نے جنرل کو ہتھیار ڈالنے کے لئے اس حد تک مصر پایا۔

تو

اس نے میز کی دراز کھولی اور ایک خط جنرل کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا "جنرل یہ تمہاری بیوی کا خط آیا رکھا ہے۔ کتنی باقاعدگی سے تم خط و کتابت کرتے ہو۔ تم اپنی بیوی کو چاہتے بھی تو بہت ہو نا فلپ نے خط اس کی طرف سرکا دیا.....

جنرل نے اذیت ناک نظروں سے فلپ کو دیکھا۔ وہ اس کا اشارہ سمجھ گیا تھا۔ فلپ اسے بتانا چاہتا تھا۔ کہ جنرل ہائی کمانڈ کے آرڈرز کو نظرانداز نہیں کر سکتا..... ان کے فیصلے کے خلاف فیصلہ کرنے کی صورت میں اس کی بیوی....."

بیوی

جو

اسے جان سے بھی پیاری تھی اور جس کے سوا اس کا دنیا میں اور کوئی نہ تھا۔

فلپ نے خط دے کر جنرل کی رکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔

"کیا سوچ رہے ہو جنرل۔" فلپ کے لبوں پر بڑی تلخ مسکراہٹ تھی۔ "ہتھیار ڈالنا..... چاہئے۔"

جنرل جواب دئے بغیر اٹھ کھڑا ہوا..... "نہیں اپنی بیرک میں جا رہا ہوں....." وہ سرد اور دل گداز لہجے میں بولا..... اور قدم دروازے کی طرف بڑھائے۔

"جنرل۔" فلپ نے اسے پکارا

لیکن

جنرل سنی ان سنی کرتے ہوئے دروازے کی طرف بڑھا۔ لیکن دروازے کھولنے سے پہلے ہی کسی نے بڑی عجلت میں دروازہ دھکیلا۔ دوسرے لمحے آرٹلری کا کیپٹن کمرے کے اندر تھا۔ وہ جنرل کو سیلوٹ کرنا بھی بھول گیا اور انتہائی بوکھلائے ہوئے لہجے میں بولا۔ "سر اطلاع ملی ہے۔ کہ اتحادی اب ٹینکوں سے حملہ کر رہے ہیں۔ ہمارے فوجیوں نے ٹینکوں کو

...ہ کی جانب بڑھتے ہوئے دیکھا ہے۔"

کیپٹن کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔

جنرل کا چہرہ دھواں دھواں تھا۔ اس نے فلپ کی طرف بڑی بے چارگی سے دیکھا۔ جو ...ت بھینچے کھڑا تھا۔

فوج کو تیاری کا حکم دو۔ فلپ نے جنرل کے حکم کا انتظار کئے بغیر سخت لہجے میں کہا۔

جنرل اور کیپٹن دونوں نے کمانڈر فلپ کی طرف دیکھا۔

پھر

"یس سر۔" کہہ کر سیلوٹ کیا اور تیزی سے باہر نکل گیا۔

جنرل بھی بنا کچھ کہے کمرے سے نکل گیا۔

تھوڑی ہی دیر بعد ہر طرف سے سائرن کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ شور مچ گیا۔ ...ڑیاں دوڑنے لگیں۔ فوجی اپنی اپنی پوزیشنیں سنبھالنے لگے۔

جنرل کے ذہن میں آندھیاں اور جھکڑ سے چل رہے تھے۔

اتحادیوں کا بلا شبہ یہ آخری حملہ تھا۔ آخری اور فیصلہ کن۔ انہوں نے بہتری ...شش کی تھی۔ کہ جرمن فوج ہتھیار ڈال دے۔ تاکہ ہزاروں فوجیوں کی جانیں بچ جائیں۔ ...ست یقینی تھی۔ اس لئے وہ بار بار انہیں ہتھیار ڈالنے پر راغب کر رہے تھے۔ لیکن ...رمنوں کی ہٹ دھرمی تھی۔ جو وہ ایسا نہیں کر رہے تھے۔ ہزاروں فوجیوں کی جانیں داؤ پر لگی ...یں۔

جنرل لڑکھڑاتے قدموں سے اپنی بیرک کی طرف بڑھ رہا تھا۔ وہ دلجمعی سے جنگ کے ...علق سوچنا چاہتا تھا۔ لیکن کوئی سوچ ذہن میں ڈھنگ سے نہ آ رہی تھی۔ ویسے بھی اس کی ...نگ کے زخم میں شدید درد تھا اور وہ بیرک میں آکر اس زخم کی مرہم پٹی کرنا چاہتا تھا۔ جنگ ...ں آخری بار کودنے کے لئے بھی سوچوں کو متوازن کرنے کی کوشش کرنا چاہتا تھا۔ فوج کو ...یاری کا حکم مل چکا تھا۔ لیکن وہ ابھی تک بٹا ہوا تھا۔

بیرک میں آتے ہی وہ اپنے بستر پر ڈھے گیا.....

چند لمحے یونہی گزر گئے۔

www.freepdfpost.blogspot.com

سائرنوں کی آوازیں تیز و تند ہو گئی تھیں اور شور شرابے میں کافی اضافہ ہو چکا تھا۔

وہ بستر سے اٹھ بیٹھا..... اسے فوج کی کمان کے لئے جانا تھا۔

جانے سے پہلے اسے اس خط کا خیال آگیا جو فلپ نے اسے دیا تھا۔ یہ خط اس کی جان سے زیادہ عزیز بیوی کا تھا.....

خط کھولتے ہوئے وہ سوچوں میں ڈوب گیا۔ اسے افسوس ہو رہا تھا۔ کہ وہ اپنی بیوی کو یہاں کی صورت حال سے خواہ مخواہ ہی مطلع کرتا رہا تھا۔ جانے وہ کتنی پریشان ہو گی۔ اس کی پریشانی کا سوچ کر جنرل کا دل جیسے بیٹھنے لگا.....

لیکن

پھر اس نے ہمت کی

اور

اپنی محبوب اور پیاری بیوی کا خط پڑھنے لگا۔

خط پڑھتے پڑھتے اس کا رنگ متغیر ہو گیا۔ اس کی حالت غیر ہونے لگی۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ پھر بیڈ کے کنارے پر بیٹھ گیا۔ اس کا مضبوط جسم بری طرح کانپ رہا تھا۔ اس کے ماتھے پر سردی کے باوجود پسینے کی نمی آگئی تھی۔ نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبائے وہ خط پڑھ کر بھی لگتا تھا جیسے کچھ نہیں سمجھا اس نے تیزی سے پھر سارا خط پڑھ ڈالا۔

اور

چند لمحوں کے لئے تو اسے یوں لگا جیسے اس کی روح اس کے جسم کا ساتھ چھوڑ رہی ہے۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں اور سر دونوں ہاتھوں پر گرا لیا.....

کئی لمحے بے جان سے گزر گئے..... سائرنوں کے شور کے باوجود جنرل کے دل و دماغ پر اک سناٹا چھایا رہا اس کی بیوی کا خط اس کے گھٹنوں پر کھلا پڑا تھا۔

اس نے لکھا تھا.....

"جان من....."

مجھے بڑا افسوس کے ساتھ تمہیں یہ خبر سنانی پڑ رہی ہے۔ جانتی ہوں۔ کہ تم جنگ میں مصروف ہو۔ اور یہ خبر تمہاری پریشانیوں میں اور اضافہ کرے گی۔ لیکن کیا کروں مجبوری

ہے۔ اس کے سوا چارہ بھی نہیں۔ کہ پھر شاید یہ سب کچھ بتانے کو میں دنیا ہی میں نہ رہوں۔ جان عزیز: جب تم یہاں سے جنگ کے لئے گئے تھے۔ تو میں اس بات سے آگاہ تھی۔ کہ مجھے کینسر جیسے موذی مرض سے نے آلیا ہے۔ اور جب آخری بار تم چند گھنٹوں کے لئے گھر آئے۔ تب میرا خیال تھا۔ کہ میں تمہیں اپنی بیماری کے متعلق بتا دوں گی۔ لیکن تمہارا آنا اور جانا اتنی عجلت میں ہوا۔ کہ میں تمہیں یہ خبر سنا ہی نہ سکی۔ پھر جیسے محاذ پر حالات ہیں سوچتی تھی اچھا ہی کیا جو تمہیں نہ بتایا۔ لیکن اب..... اب میں علاج معالجے کی حد سے باہر جا چکی ہوں۔ کمزوری اتنی ہے کہ یہ خط بھی نہیں لکھا جا رہا..... لیکن تمہیں بتانا بھی ضروری ہے کہ نہ بتانا خیانت کے مترادف ہو گا..... جب تک تمہیں یہ خط ملے گا..... میں اس دنیا سے جا چکی ہوں گی..... اس لئے تمہیں الوداعی سلام کرنے کو جی چاہا تھا..... تو مشکل سے یہ خط لکھ پائی۔ تم میرے بغیر ہنسی خوشی جینے کی کوشش کرنا۔ یہ میری آرزو ہے۔

الوداع و سلام

تمہاری اپنی اور جان سے پیاری بیوی

باہر شور بڑھتا جا رہا تھا۔

جنرل نے اپنا سر اٹھایا۔ خط پر پھر نگاہ ڈالی..... اسے اٹھایا ہونٹوں سے لگایا.....

اور

دوسرے لمحے

وہ تیزی سے کمرے سے باہر نکل گیا۔ وہ اپنے آفس کی طرف تقریباً بھاگا جا رہا تھا۔ اس نے اک فیصلہ کر لیا تھا۔

اک دھڑکے سے اس نے دروازہ کھولا۔ کمانڈر فلپ ابھی ادھر ہی تھا۔ لیکن جنرل نے اسے نظر انداز کرتے ہوئے: ہنگامی بٹن دبا دیا۔

دوسرے لمحے کیپٹن اندر آگیا۔

"کیپٹن۔" جنرل نے تیزی سے کہا

"یس سر۔" کیپٹن بولا۔

"فوج کو ہتھیار ڈالنے کا حکم دو..... جنرل چیخا

www.freepdfpost.blogspot.com

"جنرل۔" فلپ نے اس سے بھی زیادہ زور سے چیختے ہوئے کہا۔ "کیا کہہ رہ
....."

"تم نے سنا نہیں میں نے کیا کہا کیپٹن۔" جنرل کیپٹن پر گرجا۔

"تم اپنے حواس میں تو ہو جنرل۔" فلپ اس کے سامنے آگیا۔

"ہاں.....ہاں۔"

فلپ نے معتجبانہ اسے دیکھا اس کی سمجھ میں نہ آرہا تھا۔ کہ وہ جنرل سے کیا کہے۔ نہ کہے۔

تمہاری بیوی۔ فلپ کو اور کچھ نہ سوجھا تو جنرل کو بیوی کی یاد دلانے کی کوشش کی۔

میں نے آرڈر دے دیا ہے۔ جو کرنا تھا کر لیا ہے۔ یہ ہزاروں فوجیوں کی زندگی کا سو ہے۔ ان کی جانیں صرف اسی طور بچائی جا سکتی ہیں....." جنرل نے زور سے مکہ میز پر مارا ا پھر چنگھاڑا فوج کو سرنڈر کرنے کا حکم دیا جائے۔"

فلپ دم بخود تھا..... کیپٹن ہراساں نظروں سے جنرل کو دیکھ رہا تھا.....

جب جنرل پھر چیخا

تو

کیپٹن یس سر کہتے ہوئے کمرے سے نکل گیا۔

اس رات۔ اس قلعے میں۔

جرمن فوجیوں نے اتحادیوں کے سامنے ہتھیار ڈال دئے۔ ہزاروں فوجی اتحادیوں کی قید میں چلے گئے اتحادی ڈاکٹروں کی ٹیمیں پہنچ گئیں۔ زخمیوں کی مرہم پٹی ہونے لگی۔ ہنگامی حالات میں کئی جگہ ہسپتال بنا دئے گئے جہاں گولہ بارود سے مجروح جاں بلب زخمیوں کے آپریشن ہوئے اور انکی نگہداشت ہونے لگی۔

اسی رات بی بی سی نے پانچ زبانوں میں خبر نشر کی۔

ہزاروں ماؤں بہنوں نے یہ خبر سن کر اطمینان کا سانس لیا۔ ہزاروں بیویوں کے چہروں کی رونق لوٹ آئی اور ہزاروں بچے یتیم ہونے سے بچ کر خوشی سے باؤلے ہو گئے۔

PdfStuffBlogspot.com

www.freepdfpost.blogspot.com

اور

اسی رات

ایک سفید گاڑی ایک جرمن گھر کے سامنے رکی

اور

اسلحہ بردار جرمن فوجی کھٹ کھٹ کرتے گھر کے اندر داخل ہو گئے۔

گھر میں موجود جرمن خاتون کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ وہ کچھ نہیں بولے اشارہ کرتے ہوئے اپنا سیٹ لینے اندر چلی گئی۔ جب وہ واپس آئی تب بھی اس کے چہرے پر وہی اطمینان بھری مسکراہٹ تھی۔۔۔

ایک جرمن فوجی افسر نے آگے بڑھ کر اس کے ہاتھوں میں ہتھکڑی ڈال دی۔۔۔ اور وہ بڑے اطمینان سے قدم اٹھاتی ان کے ساتھ چل دی۔

اس کی شکل و صورت اور صحت دیکھ کر کوئی عام سا شخص یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ کینسر جیسا موذی مرض چھوکر بھی گزرا ہوگا۔

بیری سجن

دونوں گتھم گتھا تھے۔ نورے نے دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں اس کے بالوں میں بھر رکھی تھیں اور پوری قوت سے بال نوچ کر اس کا سر نیچے کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ کرمے نے ایک ہاتھ اس کے بالوں میں اڑس رکھا تھا اور دوسرے سے اس کی گردن دبوچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ دونوں ایک دوسرے پر پوری طاقت سے حملہ آور تھے۔ تکلیف و اذیت سے دونوں ہی چیخ بھی رہے تھے۔ گلی میں قلفی والے کی ریڑھی کے ارد گرد کھڑے بچے نورے اور کرمے کی لڑائی دیکھ کر ادھر بھاگے۔ حویلی کا بڑا چوبی پھاٹک پل بھر میں عبور کر کے صحن میں ان کے ارد گرد آن کھڑے ہوئے۔ پہلے تو سب بچوں نے دلچسپی سے تماشا دیکھا۔ تالیاں پیٹیں اپنے اپنے ساتھی کی حمایت میں نعرے لگائے لیکن جب نورے اور کرمے کی چیخ پکار زیادہ بڑھی تو انہوں نے آگے بڑھ بڑھ کر انہیں چھڑانے کی کوشش کی۔ اس کوشش میں کسی کو دھکا پڑا کسی کو لات لگی۔ سب پرے ہٹ گئے۔ تب ہی سات آٹھ سالہ زینب چیختی ہوئی دوڑی "میں چاچی کو بلاتی ہوں۔ مار پڑے گی تب ہی ایک دوسرے کو چھوڑیں گے۔ چاچی ڈنڈا لے کر آئے گی۔"

"ہاں ہاں بلاؤ چاچی کو" دس سالہ فضلے بولا "بلکہ ماسی آمنہ کو بھی بلاؤ۔ اس نورے کی خبر لے۔ ڈرتا تو ہے ہی نہیں کسی سے "اپنی اماں سے ہی سنبھلے گا۔"

زینب بھاگتی ہوئی صحن پار کر کے درمیانی دروازے کو دھکیلتے ہوئے برابر والے نسبتاً چھوٹے صحن میں آ گئی۔ ادھر ادھر دیکھا۔ چاچی صحن کے آخری کونے میں ہینڈ پمپ تلے

www.freepdfpost.blogspot.com

کپڑے دھو رہی تھی۔

"اے چاچی' چاچی" زینب دور ہی سے چلائی۔

"کیا ہے بنو۔" چاچی نے ہاتھ روک کر اس کی طرف دیکھا۔

"چاچی وہ پھر لڑ رہے ہیں۔" پھولے سانسوں سے زینب نے کہا۔

"لڑنے مرنے دے انہیں۔" چاچی نے بے پروائی سے کہا۔ "خود ہی ٹھیک ہو جائیں گے۔ پل نہیں لگتا مرنے مارنے پر اتر آتے ہیں۔ پل نہیں گزرتا لاڈ پیار میں لگے ہوتے ہیں۔ رہنے دے۔"

"ہائے چاچی۔" زینب نے اپنے گول مٹول ہاتھ سینے پر مارتے ہوئے کہا "نورا کرے کو مار رہا ہے۔"

"چاچی نے مسکرا کر بڑے پیار سے زینب کو دیکھا اور بولی۔ "تو تو یہی کہے گی پر میں اپنے کرے کو جانتی ہوں۔ کچھ کم وہ بھی نہیں..... حساب برابر کر لیتا ہے۔

"پر چاچی پہلے تو نورا ہی اسے چھیڑتا ہے۔" زینب اس کے قریب آ گئی اور اس کے گیلے ہاتھ پکڑتے ہوئے بولی۔ "اٹھو نا چاچی! وہ اسے بہت مار رہا ہے۔"

"آئے ہائے۔" چاچی نے اپنے گیلے ہاتھ پاس پڑی خشک چادر سے پونچھتے ہوئے کہا "ان کی لڑائی کوئی نئی بات ہے۔ مجھے بلانے بھاگی آئی۔ جا کے نورے کی اماں سے کہو۔ چوہدرانی سامنے ہی تو بڑے دالان میں بیٹھی ہو گی۔"

"تم چلو نا" زینب نے روہانسی آواز میں کہا "ماسی آمنہ باہر آ گئی تو وہ بھی کرے ہی کو مارے گی۔

صاحباں کھلکھلا کر ہنسی اور ہاتھ پونچھ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ پھر جھک کر زینب کے گورے گورے گول مٹول گال پر پیار کرتے ہوئے بولی "ماسی آمنہ نورے کا قصور ہو تو اسے خوب پیٹتی ہے۔ لحاظ نہیں کرتی کہ اکلوتا پتر ہے۔"

"ایویں....." زینب نے منہ بنایا "وہ بھی کرے ہی کو مارتی ہے۔"

"نہیں بنو..... یہ بات نہیں چل دیکھتے ہیں۔ وہ نگوڑ مارے اب بھی لڑ رہے ہیں یا صلح کر لی۔"

صاحباں نے زینب کا ہاتھ پکڑا۔ اس کے کپڑے گیلے ہو رہے تھے۔ چارپائی پر پڑا ململ

کا رنگ دار دوپٹہ اس نے سر پر ڈال لیا۔ زینب ہاتھ چھڑا کر آگے آگے دوڑی۔ صاحباں اس کے پیچھے پیچھے درمیانی دروازے کی طرف بڑھی۔ جس کے دوسری طرف لمبا چوڑا سرخ اینٹوں والا چوہدری حشمت خان کی حویلی کا صحن تھا..... صحن میں بیرونی دیواروں کے ساتھ بڑے بڑے چھتنار درخت تھے۔ آگے کیاریاں تھیں اور ان میں رنگا رنگ پھول لہلہا رہے تھے۔ حویلی کا صدر دروازہ بہت بڑی ڈیوڑھی میں کھلتا تھا۔ اسی ڈیوڑھی میں چوہدری کی بیٹھک کا دروازہ بھی تھا۔ جو اس وقت بند تھا۔

صاحباں درمیانی دروازے سے گزر کر آگے بڑھی۔ زینب اس سے پہلے دونوں لڑکوں کے قریب پہنچ گئی تھی۔ وہاں اور بھی بہت سے بچے تھے اور فضلے' چوہدرانی آمنہ کو بھی صاحباں کے آنے سے پہلے ہی بلا لایا تھا۔ جس نے دونوں کو بمشکل الگ کیا تھا اور دونوں کے کان پکڑے کہہ رہی تھی۔ "کم بختو۔ کسی دن ایک دوسرے کو مار ڈالو گے۔ جنگلی سورو۔ لڑنا مرنا ہی ہے تو ایک دوسرے سے الگ رہا کرو۔"

صاحباں قریب آ گئی۔ "پھر لڑ پڑے" صاحباں نے کرے کا ہاتھ سختی سے پکڑ کر جھٹکا۔

"مجھے تو فضلے نے بتایا۔" چوہدرانی اپنے بھاری بھرکم وجود کو سیدھا کرتے ہوئے بولی "دیکھو تو دونوں کا حال۔"

"ایک ایک لگاؤ دونوں کو" صاحباں نے کہا۔

"کچھ اثر تھوڑا ہی ہو گا۔"

دونوں بچے اب مٹھیاں آنکھوں میں گھسا کر رو رہے تھے۔ دونوں کے چہرے سرخ تھے اور بال بکھر گئے تھے۔ کرے کی قمیض کا گریبان بھی ادھڑ گیا تھا اور نورے کی آستین کہنی تک کھل گئی تھی۔

"ان کا کیا کریں چوہدرانی!" صاحباں نے بیزار ہو کر ایک دھپ کرے کی کمر میں لگایا۔

"اے ہے مارتی کیوں ہے صاحباں' دونوں ہی قصوروار ہیں۔" آمنہ نے اس کا بازو پکڑ لیا۔ "پھر مارنے کا فائدہ۔ ابھی لڑے ہیں' تھوڑی دیر بعد ایکو ایک ہوں گے۔"

"پر چوہدرانی۔ اب یہ بالکل بچے تو ہیں نہیں۔ دس دس گیارہ گیارہ سال کے ہو رہے ہیں۔ اسکول پڑھ رہے ہیں۔ کوئی تمیز نہیں آئی انہیں۔ چوہدری صاحب بھی دھیان نہیں

www.freepdfpost.blogspot.com

دیتے نا۔ بس پیار میں ٹال جاتے ہیں۔ انہیں ان کم بختوں پر رعب ضرور رکھنا چاہئے۔"

"چوہدرانی ہنس کر بولی" کئی دفعہ آرام اور پیار سے سمجھاتے ہیں دونوں کو۔ اور میں تو مارتی پیٹتی بھی ہوں۔ پر مجال ہے جو ان پر کوئی اثر ہو۔"

"شریک تو ہیں نہیں۔ پر شریکوں سے بدتر ہیں۔ اللہ جانے کیا بانٹنا ہے انہیں۔ نہ جائیداد سانجھی ہے۔ نہ ہی کوئی اور شے..... پھر بھی اس طرح لڑتے ہیں۔"

"دماغ جو الٹے ہیں۔" آمنہ بولی۔ پھر دونوں کو جھنجوڑتے ہوئے کہا "آج تو میں نے تمہیں چھوڑ دیا ہے آئندہ اس طرح لڑتے دیکھا تو دونوں کی مار مار کے چمڑی ادھیڑ دوں گی سمجھے؟"

اس نے نورے کو جھٹکا دے کر کہا۔ "دفع ہو جا دالان میں۔ اب باہر نہیں آنا" اور پھر کرمے کو دھکیل کر بولی "بھاگ جا اپنے گھر' ادھر نہیں آنا اب۔"

نورا منہ بسورتے ہوئے دالان کی طرف بڑھ گیا۔ کرما آنکھوں میں مٹھیاں گھسیڑتا اپنے گھر چلا گیا۔ صاحباں نے سب بچوں سے کہا "جاؤ بھاگو تم لوگ بھی۔ چھٹی کا دن گلیوں میں ڈنڈے بجاتے گزارنا ضروری ہوتا ہے کیا؟ جاؤ پڑھو لکھو بیٹھ کر۔"

"میں تو اسکول کا کام کر کے آئی ہوں چاچی۔" زینب نے معصومیت سے کہا۔

"شاباش" آمنہ بولی "سیانی بچی ہے تو۔"

بچے ایک ایک کر کے جانے لگے۔ زینب گھر جانے کے بجائے صاحباں کے گھر کی طرف جانے کو مڑی تو آمنہ نے پوچھا۔

"اے زینب۔ تیری اماں کہاں ہے؟"

"وہ شہر گئی ہے" وہ رک گئی۔

"کیوں؟"

"کپڑے لینے۔"

"کس کے؟"

"میرے ماسی۔ چمک چمک والے کپڑے لائے گی میرے لئے۔ بڑے سوہنے سوہنے ہاں۔"

صاحباں نے پیار سے اس کے سر پر ہاتھ رکھا اور بولی۔ "تجھے تو تیری اماں ہمیشہ ہی سوہنے کپڑے پہناتی ہے۔ ایک اکیلی جو ہے۔"

"اور اتنی سوہنی بھی" آمنہ نے پیار سے زینب کو دیکھا۔

"سوہنی تو ہے ہی۔ گال تو دیکھو جیسے سیب ہیں کشمیری۔" صاحباں نے اس کے گول گول لال لال گالوں پر ہولے سے چٹکی کاٹی۔

زینب خوش ہو گئی اور چھلانگیں لگاتی بھاگ گئی۔

صاحباں نے کہا "بیگماں خود بھی سوہنی ہے۔ پر یہ بیٹی....."

"ماں اور باپ دونوں خوبصورت ہیں۔ ظاہر ہے اولاد بھی خوبصورت ہی ہونا تھی۔"

"اے ہے بیٹے تو بس ایسے ہی ہیں۔ یہی بہت پیاری ہے۔ مانو بلی سی ہے بالکل۔ بہت پیاری لگتی ہے ایمان سے۔"

"عادتیں بھی پیاری ہیں۔ اسی لئے زیادہ اچھی لگتی ہے۔"

دونوں کچھ دیر زینب ہی کی باتیں کرتی رہیں۔ پھر آمنہ نے کہا "آؤ صاحباں' اندر چل کر بیٹھیں۔"

"نہیں چوہدرانی۔ میں تو کپڑے نلکے کے نیچے چھوڑ کر آئی ہوں۔ دھو رہی تھی۔

"اے ہے خود کیوں دھو رہی تھیں۔ وہ مہرو کہاں ہے؟"

"وہ دانے پھٹک رہی تھی۔ کرمے کے اسکول کے کپڑے تھے۔ میں نے سوچا اس کے دانے پھٹکنے تک میں دھو لوں گی۔ ان کم بختوں کی لڑائی نے....."

آمنہ اس کی بات کاٹ کر ہاتھ ہلاتے ہوئے بولی "اے رہنے دے۔ لڑتے ہیں' تو کیا ہوا۔ دوستی بھی تو ہے دونوں میں۔ ابھی دیکھنا پھر اکٹھے ہوں گے' کھیل رہے ہوں گے۔ ایک دوسرے کے بغیر رہتے بھی تو نہیں۔ آپس میں لڑتے ہیں لیکن طرفداری بھی کتنی کرتے ہیں ایک دوسرے کی۔ یاد نہیں۔ اس لوہار کے بیٹے نے جب کرمے کو مارا تھا تو نورا کس طرح اس پر پل پڑا تھا۔"

ہاں یہ تو ہے۔"

"پھر لڑتے ہیں تو کیا ہوا؟"

www.freepdfpost.blogspot.com

"ہائے چوہدرانی' کسی وقت کسی کا سر پھٹ جائے گا' ٹانگ ٹوٹ جائے گی۔ چھڑانا تو ہوتا ہی ہے۔"

"بس ذرا دھیان رکھا کرو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ ابھی لڑے ہیں نا۔ کچھ دیر بعد دیکھنا' دونوں زیادہ دیر تک الگ رہ بھی تو نہیں سکتے۔"

"ہاں۔" صاحباں نے کہا اور پھر اپنے گھر کی طرف مڑتے ہوئے بولی۔ "زینب ادھر گئی ہے۔ ضرور کرا اس کے ہاتھ نور محمد کے لئے کوئی پیغام بھیجے گا۔"

چوہدرانی کھلکھلا کر ہنس پڑی "بالکل" پھر صاحباں اپنے گھر کی طرف چلی دی اور چوہدرانی اپنا بھاری بھرکم وجود سمیٹے ادھر دالان کی طرف چل دی۔ جدھر وہ جلاہے کے ہاں سے بن کر آنے والے کھیسوں کو دیکھ رہی تھی۔

صاحباں صحن میں آئی تو دیوار کے ساتھ لگی چارپائی پر کرما بیٹھا تھا۔ زینب بھی پائنتی کی طرف کھڑی تھی۔ صاحباں تل کی طرف جانے کے بجائے اس طرف آئی اور کرمے کے پاس بیٹھتے ہوئے اس کا کان پکڑ کر سختی سے بولی "اے' تو باز آئے گا یا نہیں۔ ہر وقت لڑتا رہتا ہے۔"

"چاچی' نورا اس سے لڑتا ہے۔"

"تو بس کر زینے یہ کیا کم ہے۔"

"میں نے کچھ نہیں کیا تھا۔"

"کچھ نہیں کیا تھا۔ تو کیا نورے کا دماغ پھر گیا تھا۔"

"کرما اپنا کان چھڑاتے ہوئے شاکی لہجے میں بولا۔ "اس کو کچھ نہیں کہتی ماں۔ میرا گلی ڈنڈا اس نے چھین لیا تھا۔ جو چیز میں لیتا ہوں وہ اڑا لیتا ہے۔"

"تو بھی کون سا کم ہے۔"

"میں کبھی پہل نہیں کرتا۔"

"چل جا۔ جانتی ہوں میں تجھے۔ ہزار بار سمجھاتی ہوں' اس سے ماتھا نہ لگایا کر۔ ابھی تو بات چوہدرانی تک رہی ہے۔ جو چوہدری نے کسی دن دیکھ لیا تو یاد رکھنا چمڑی ادھیڑ دیں گے۔ نورا چار بیٹیوں کے بعد ان کا اکلوتا بیٹا ہے۔"

میں کیا کروں۔ ہے تو ہوا کرے۔ مجھ سے لڑے گا تو میں بھی لڑوں گا۔" وہ غرایا تو صاحباں نے اس کی کمر میں دھپ جماتے ہوئے کہا۔ "تو سمجھے گا تھوڑا ہی' کم بخت وہ بڑے باپ کا بیٹا ہے۔ دو گاؤں میں ان کی زمینیں پھیلی ہیں۔ تیرے باپ کے پاس کیا ہے۔ آدھا مربعہ زمین؟ شکر ہے' جو وہ ہم سے برابر کے لوگوں کی طرح ملتے ہیں۔ تمہاری حرکتیں آخر کب تک برداشت کریں گے۔ میری تو سنتا ہی نہیں۔ اپنے میں رہا کر کرما اپنے میں رہا کر۔"

"ہونہہ" کرمے نے کندھے اچکائے۔ "وہ جو جی چاہے کرے۔ میں اس سے دبتا ہی ہوں؟"

صاحباں نے ماتھے پر ہاتھ مارا اور اسے سمجھانے لگی۔ اپنی اور نورے کی مالی حیثیت سے آگاہ کرنے لگی۔ چوہدری کے احسانات جو اس کے خاندان پہ تھے' گنوانے لگی۔ کرما بچہ تو تھا۔ ماں کے واویلے سے کچھ ڈرا' کچھ سمجھا لیکن پھر بھی کہنے لگا۔ "میں پہل نہیں کرتا ماں۔ وہی زیادتی کرتا ہے۔ میری ہر چیز پر قبضہ کرنا چاہتا ہے۔ میری کاپیاں جن پر ماسٹر صاحب نے شاباش لکھی ہوتی ہے' پھاڑ ڈالتا ہے۔ میں دوڑ میں آگے نکل جاؤں تو وہ غصے میں آ جاتا ہے۔"

"تو نہ دوستی رکھ نا اس سے۔ تیری بھی تو سمجھ میں نہیں آتی۔ ابھی لڑتے ہو۔ ابھی کھیلنے لگو گے۔"

صاحباں بہت دیر تک اسے سمجھاتی رہی۔ زینب بھی وہیں کھڑی تھی۔ کبھی کبھی وہ چاچی کی بات کاٹتی لیکن وہ اسے چپ کرا دیتی۔ کرمے پر اس کی باتوں کا وقتی طور پر اثر ہوتا تھا۔ آج بھی ہوا اور اس نے ماں سے کہا "آج سے میری اور نورے کی پکی کٹی۔"

لیکن یہ پکی کٹی اتنی کچی تھی کہ جب نورے نے دیوار پر سے جھانک کر اسے آواز دی "اوئے کرمے گڈی اڑائے گا۔" تو کرما ہاں کہتے ہوئے جھٹ سے یہ جا وہ جا۔

کچھ ہی دیر بعد وہ دونوں حویلی کی چھت پر تھے۔ پتنگ بازی ہو رہی تھی۔ نورا پتنگ اڑا رہا تھا' ڈور کی چرخی کرمے کے ہاتھ میں تھی۔ زینب اور گلی کے دوسرے بچے بھی ساتھ تھے' شور مچا رہے تھے' تالیاں پیٹ رہے تھے اور بوکاٹا کا شور دور دور تک سنائی دے رہا تھا۔

یہ تقریباً روز ہی کا معمول تھا۔ روز ہی کرمے اور نورے میں لڑائی ہوتی۔ کبھی دھکم

www.freepdfpost.blogspot.com

پیل، کبھی گالی گلوچ اور کبھی دھینگا مشتی پھر روز ہی دونوں میں آپ ہی صلح ہو جاتی۔ دونوں مل کر بیٹھتے، جی بھر کر کھیلتے، اسکول کی کتابیں پڑھتے اور گھر کا کام کرنے میں ایک دوسرے کی مدد کرتے۔ دونوں تقریباً ہم عمر ہی تھے۔ نورا دبلا پتلا تھا۔ اکلوتا ہونے کی وجہ سے لاڈلا تھا۔ اس لئے قدرے اکھڑ اور ضدی تھا۔ صاحب ثروت آدمی کا بیٹا تھا اس لئے بچپن ہی سے جو چاہا سو پایا تھا۔ اس کی ہر خواہش اور ہر فرمائش پوری کرنا ماں باپ اپنا فرض سمجھتے تھے۔ وہ نہ سننے کا عادی ہی نہیں تھا۔ اسی وجہ سے من مانی کرنے کا خوگر ہو چلا تھا۔ اپنی پسند اور ناپسند دوسروں پر بھی مسلط کرنے کی عادت پختہ ہو چکی تھی۔ اپنے سے آگے بڑھتے کسی کو دیکھ نہیں سکتا تھا۔ کسی کی کوئی چیز پسند آجاتی تو جب تک اسے حاصل نہ کر لیتا خود چین سے بیٹھتا نہ گھر والوں کو چین لینے دیتا۔ کبھی کبھی گھر والے اس کی اس عادت سے نالاں بھی ہوتے فکر مند بھی دکھائی دیتے سمجھانے کی کوشش کرتے لیکن اس کی عادتیں ایسی نہ تھیں جنہیں کوشش سے بدلا جا سکتا۔ یہ عادتیں اس کی فطرت بنتی جا رہی تھیں یا شاید یہ فطرت ہی کا حصہ تھیں۔ اس کی ماں آمنہ اکثر فکر مند ہو کر چوہدری سے کہتی "بچے کی اٹھان اچھی نہیں ہو رہی۔"

لیکن چوہدری ہنس کر بات ٹال دیتا اور کبھی سینہ تان کر کہتا۔ "اتنے بڑے چوہدری کا بیٹا ہے وہ۔ یہ عادتیں ہی اسے منفرد بنائیں گی۔ آخر وہ عام آدمیوں سے الگ کیسے جانا جائے گا۔ اس نے میری گدی سنبھالنا ہے، مجھ سے کئی ہاتھ آگے بڑھے گا تب بات بنے گی۔ میں تو اس کی ان عادتوں سے بہت خوش اور مطمئن ہوں۔ گاؤں کے وڈیرے کو، چوہدری کو ایسا ہی ہونا چاہئے تب ہی وہ سب پر حکمرانی کر سکتا ہے۔ میرا بیٹا اس گاؤں کا چوہدری نہیں حکمران ہے حکمران۔"

نورا باپ کی شہ پاتا، اس کا حوصلہ اور بلند ہو جاتا۔

کرم علی اس کے مقابلے میں جسمانی طور سے خاصا تنومند تھا لیکن اس کے باپ کی مالی حیثیت اس خاندان کے مقابلے میں کچھ نہ تھی۔ گو دونوں خاندانوں میں میل ملاپ اور راہ رسم دنیا داری برابر کی حیثیت سے نبھ رہی تھی پھر بھی کرمے کو ہمیشہ اس بات کا احساس دلا جاتا تھا کہ وہ نورے کے مقابلے میں کم تر حیثیت رکھتا ہے۔ اس کی ماں صاحباں تو ہمیشہ ہی اس کے ذہن نشین یہ بات کراتی تھی۔ چوہدری سے ان لوگوں کی دور پار کی رشتے داری بھی

ویسے بھی چوہدری ان کا بہت خیال رکھتا تھا۔ ہر وقت مدد کے لئے تیار ہوتا۔ کبھی تنگی ترشی کا وقت آن پڑتا تو ان کا ہاتھ تھامنے سے نہ چوکتا، زمینوں کے بٹوارے میں چوہدری ان کا ساتھ نہ دیتا تو شاید آدھا مربعہ زمین جو ان کے حصے میں اب آئی تھی وہ بھی نہ ملتی۔ یوں یہ لوگ چوہدریوں کے احسان کے بار تلے دبے ہوئے تھے اور یہی وجہ تھی کہ صاحباں کرمے کو سمجھاتی رہتی، ہمیشہ تلقین کرتی کہ نورے سے لڑائی جھگڑا نہ کیا کرے۔

صرف لڑائی جھگڑا ہی ہوتا تو شاید اب تک کرما اور نورا دو مخالف کمپنیں بن چکے ہوتے لیکن لڑائی کے ساتھ جو دوستی تھی اس نے انہیں متوازی خطوط بنا رکھا تھا اور یہ بات ان کے سب ساتھی سنگی بھی اچھی طرح جانتے تھے۔ وہ ان کے ساتھ ہی پل بڑھ رہے تھے۔ وہ ان کی دوستی کو بھی جانتے تھے اور دشمنی سے بھی آگاہ تھے۔

فضلے، خیرا، منا، راحیل، امجد، شمی، زینب، کاکا سب ان کے دوست تھے۔ ان کے ساتھ کھیلا کرتے تھے۔ وہ انہیں بیری بجن اور دوست دشمن کے نام سے بھی پکارا کرتے تھے۔

وقت گزر رہا تھا۔ شب و روز تبدیلیوں کے محرک تھے۔ لڑکپن کی حدیں ختم ہو رہی تھیں، شعور و آگہی ذہنوں پر دستک دے رہی تھی۔ جسموں کے پروان چڑھنے کے ساتھ دوستی اور دشمنی کے جذبے بھی پروان چڑھ رہے تھے۔ وہ دونوں اب بھی وہی تھے جو بچپن سے چلے آ رہے تھے، ہاں اب ہاتھا پائی اور گالی گلوچ نہیں ہوتا تھا، نہ ہی دونوں گنواروں کی طرح جھگڑتے تھے۔ ہاں جب بھی اختلاف ہوتا یا کوئی بات فیصلے کے مرحلے میں داخل نہ ہو سکتی تو دونوں شرط بد لیتے، کبھی کرچت کرنے کی، کبھی پنجہ لڑانے کی اور کبھی سکہ پھینکنے کی۔ اس طرح دونوں دوستوں اور سنگیوں کی موجودگی میں فیصلے کے مرحلے سے گزر جاتے، جو ہار جاتا وہ دل سے اپنی ہار تسلیم کر لیتا اور جو جیت جاتا وہ اپنی جیت دوسرے سے منوا لیتا۔

ان دنوں وہ دسویں جماعت میں تھے۔ اسکول میں ڈراما ہونا تھا اور اس کے لئے ہیرو کا چناؤ تھا۔ کرمے اور نورے دونوں کی خواہش ہیرو بننے کی تھی۔

"میں ہیرو بنوں گا۔" نورے نے سینہ تان کر کہا تو کرما بگڑ گیا "میں کیوں نہیں؟"

"بس میری مرضی۔" وہ بولا۔

"میری بھی مرضی، کر لو جو کچھ کرنا ہے۔" کرمے نے تنک کر کہا "دیکھتا ہوں تمہاری

www.freepdfpost.blogspot.com

مرضی کیسے چلتی ہے۔"

"اوئے کرمے، تڑی نہ دے۔ یہ بات تو منٹوں میں ہو سکتی ہے۔ میرے ابا کا اشارہ ہی کافی ہے۔"

"اوئے نورے" کرمے نے کمر پر ہاتھ رکھ کر دوسرے ہاتھ سے اس کے جبڑے ہلاتے ہوئے کہا "باپ کی بیساکھیوں پر کب تک چلے گا۔ مزہ تو جب ہے کہ خود سے چنے جاؤ۔"

"یہ بات ہے؟"

"ہاں۔"

"تو پھر دیکھ لینا۔ خود سے چنا جاؤں گا۔"

"بے ایمانی نہیں کرے گا نا؟"

"نہیں۔ قسم لے لے۔"

"تو پھر یقین کر لے کہ ہیرو میں بنوں گا۔ مجھ میں سارے وصف ہیں اس کردار کے۔ تو لم تڑنگ سوکھا سڑا ہیرو نہیں بن سکتا۔"

"تو مجھ سے خوبصورت نہیں ہے سمجھا!"

"یہ تو چناؤ کرنے والے بتائیں ے۔"

دونوں میں تو تو، میں میں ہونے لگی۔ دونوں کے مشترکہ دوست بیچ میں آ گئے "یارو لڑتے کیوں ہو، پنجہ لڑا کے فیصلہ کر لو۔"

"منظور ہے" کرما بولا اور اپنا مکا ہوا میں لہرانے لگا۔

نورا کچھ خائف ہوا لیکن سب کے سامنے اس کا اظہار نہ کیا اور آستین اونچی کر کے مٹھی کس کر بولا "آجاؤ کر لیتے ہیں فیصلہ۔"

دونوں نے پنجہ لڑایا۔ کافی دیر زور آزمائی ہوئی آخر کار جیت کرمے کا مقدر بنی۔ جسے نورے کو تسلیم کرنا پڑا۔ دونوں ایک دوسرے سے لپٹ گئے۔ نورے نے کرمے کو مبارک دی۔ کرمے نے ہنس کر کہا "کہو تو تمہارے حق میں دستبردار ہو جاؤں یار۔"

"نہیں" نورے نے سبکی محسوس کی "میں اس جیت کو نہیں مانتا جو جھولی میں خیرات کی طرح ڈالی جائے۔"

"او زندہ باد میرے یار۔" فضلے اور منے نے کہا۔ کرما بھی مسکرانے لگا پھر اس نے نورے کی گردن میں بازو ڈال کر کہا "مجھے تڑی نہ دیا کر بس۔ جب تم ضد کرتے ہو تو میں بھی ضد میں آ جاتا ہوں۔ دوستوں کی طرح اخلاق سے کہتے تو میں تمہارے ساتھ کبھی مقابلہ نہ کرتا۔"

نورے نے کہا "اسے بھی ایک طرح کی خیرات ہی سمجھتا ہوں میں۔"

"تمہاری مرضی۔"

اس طرح کئی بار ہوا۔ اور اب نورا محسوس کرنے لگا تھا کہ فیصلہ اسی طرح کیا جاتا رہا تو وہ ہمیشہ ہی ہارتا رہے گا کیونکہ روز بروز کرما زیادہ تنومند اور طاقتور ہوتا جا رہا تھا۔ وہ خود کوئی مریل یا لاغر نہیں تھا لیکن وہ محسوس کرنے لگا تھا کہ وہ جسمانی لحاظ سے کرمے کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔

اب اس کے ذہن میں ہر وقت الجھن رہتی اور وہ کرمے کو نیچا دکھانے کی سوچتا رہتا۔ اب کرچت کرنے یا پنجہ لڑانے سے فیصلے کرنے والی بات اسے قبول نہ تھی۔ براہ راست مقابلہ کچھ مشکل تھا اس لئے وہ ہیرا پھیری کے چکروں میں پڑ گیا۔ کئی بار اس ہیرا پھیری سے اسے خاطر خواہ کامیابی بھی ہوئی۔ اس کامیابی نے اسے اندر ہی اندر بے ایمانی کر گزرنے کی راہ پر ڈال دیا۔ کرمے کو بھی اس بات کا پتا چل گیا۔ اسے دلی دکھ بھی ہوا اور کئی بار اس نے اشاروں کنایوں سے اس زیادتی سے اسے باز بھی رکھنا چاہا لیکن وہ اپنی راہ پر گامزن رہا۔

دن گزرتے چلے گئے۔ موسم بدلے، رت بدلی۔ کھیتوں میں کبھی فصلیں لہرائیں، کبھی ہل چلے، نورا، نور محمد چوہدری بن گیا۔ کرمے کو بھی اب کرم علی پکارا جانے لگا لیکن ذاتی اور مشترک دوستوں میں وہ نورا اور کرما ہی تھے۔

دونوں اب گبھرو جوان تھے۔ کرمے نے باپ کا کام مکمل طور پر سنبھال لیا اور نور محمد باپ کے مرنے کے بعد چوہدری کی دستار سر پر رکھ کر گاؤں کا معتبر اور معزز نوجوان بن گیا۔

لیکن کرمے اور نورے کی دوستی دشمنی اپنی جگہ رہی۔

ان جذبوں کا نقطہ آغاز کہاں تھا؟ شاید یہ جذبے ان کے وجودوں سے لپٹے ہوئے ہی معرض وجود میں آئے تھے۔ وقت کے ساتھ ان میں تبدیلی ضرر آئی تھی لیکن انھان کی اساس

www.freepdfpost.blogspot.com

بہت پرانی تھی۔ اب دونوں جوان تھے لیکن شاید ایک دوسرے سے خائف' یہی خوف ان جذبوں کی زندگی تھا۔ نور محمد کی مالی حیثیت کرمے سے بہت بلند تھی لیکن وہ اس کی وجاہت' شجاعت اور ہمت سے خوفزدہ ہوتا تھا۔ وہ اندر ہی اندر جان چکا تھا کہ جیت کرمے ہی کے مقدر کا حصہ ہے۔ اسی لئے اس نے ہیرا پھیری اور بے ایمانی شروع کر دی تھی۔ اور یہ پنپ اس لئے رہی تھی کہ کرمے کے اندر بھی ایک غیر محسوس سا خوف تھا جو بچپن ہی سے اس کے ذہن میں صاحباں نے بٹھا دیا تھا۔ اسی لئے وہ نورے سے دب جاتا تھا' اس کی بات مان لیتا تھا لیکن جب اس کی انا کا مسئلہ ہوتا تو وہ اپنے اس ان دیکھے خوف کو بڑی جرات سے پرے دھکیل دیتا۔

تین چار گاؤں مل کر گھڑ سواری کے مقابلے کا اہتمام کر رہے تھے۔ بڑے بڑے شہ سوار اس میں حصہ لے رہے تھے۔ نور محمد اپنے گاؤں کا چوہدری تھا۔ جیالا جوان اور گھوڑوں کا شوقین تھا۔ شہ سوار بھی تھا لیکن وہ کرمے کو بھی جانتا تھا۔ اس کے پاس گو نورے کی طرح گھوڑوں کا اصطبل نہیں تھا لیکن وہ بھی بلا کا شہ سوار تھا۔ اس کا چتکبرا گھوڑا تیز رفتاری کے لئے مشہور تھا۔

نورا یہ مقابلہ خود جیتنا چاہتا تھا اور وہ جانتا تھا کہ مقابلہ صرف اسی صورت جیتا جا سکتا ہے کہ کرمے کو اس مقابلے میں حصہ نہ لینے دیا جائے۔

اس نے باتوں ہی باتوں میں کرمے کو ٹٹولا تو اسے پتا چلا کہ کرما اس مقابلے میں زور و شور سے حصہ لینے والا ہے۔

کرما ہنس کر بولا "باقی لوگوں کو تو چھوڑ' صحیح مقابلہ تو میرا تمہارا ہو گا۔ تم بھی مانے ہوئے شہ سوار ہو اور میں بھی گھڑ سواری کا شوق رکھتا ہوں۔"

"تو تم ضرور ہی حصہ لو گے؟"

"اور نہیں تو کیا۔"

"ہوں!"

"کیوں۔ تم نہیں چاہتے کہ میں حصہ لوں؟ ایک بار کہہ دو۔ میں واقعی حصہ نہیں لوں گا۔ تم ہی جیت اپنے کھاتے میں ڈال لینا۔"

"دیکھو کرمے' تمہاری یہ باتیں مجھے اچھی نہیں لگتیں۔ میں جیت بھیک میں نہیں لیتا۔ میرے بازوؤں میں اتنی طاقت ہے کہ وہ تمہیں پچھاڑ سکیں۔" اس نے ہاتھ اپنے بازو پر پھیرا۔

"ہو گئی شرط۔" کرمے نے ہاتھ بڑھایا۔

"کیا۔ شرط کیسی۔"

"جیتنے کی۔"

"میں جیت کر دکھاؤں گا تمہیں۔"

"شرط لگا لو۔"

"ضرورت کیا ہے۔ جیتنا ہے بس جیت لیں گے۔"

"ایمانداری شرط ہے۔"

"تو کیا تم مجھے بے ایمان سمجھتے ہو۔"

"نہیں نہیں۔ غصے میں کیوں آ گئے۔ تم بے ایمان کیوں ہونے لگے۔"

"تو پھر؟"

"پھر یہی کہ ایمانداری شرط ہے۔"

"دونوں میں اسی بات پر کچھ دیر تو تکرار ہوتی رہی پھر فیصلہ یہی ہوا کہ نورا اور کرما دونوں ہی گھڑ دوڑ میں حصہ لیں گے۔

جیت کے لئے شرط بھی منظور ہو گئی۔ دونوں کی زمینوں کے درمیان ایک متنازعہ کھیت تھا۔ یہ متنازعہ کھیت جھگڑا کبھی نہیں بنا کیونکہ اس کو کھلی زمین قرار دے کر چھوڑ دیا گیا تھا۔ چوہدری شجاعت اور کرمے کے باپ نے تنازعے کا یہی پرامن حل تلاش کر لیا تھا لیکن جب سے نورے نے چوہدراہٹ سنبھالی تھی یہ کھیت اسے کھٹکتا تھا۔ وہ اسے اپنی لمبی چوڑی راضی میں شامل کرنے کا خواہش مند تھا۔ لیکن بات کرمے سے نہیں کر پاتا تھا۔ ہاں اپنے بھروسے کے ساتھیوں سے وہ کئی بار اس خواہش کا اظہار کر چکا تھا۔ ان آدمیوں میں ایک فضلے بھی تھا۔ بچپن کا فضلے' کرمے اور نورے کا مشترک دوست۔ جو اب بھی دوست تھا لیکن ذاتی مفادات نے اسے نورے کے قریب تر کر دیا تھا۔

www.freepdfpost.blogspot.com

نورے نے کرمے کے مقابلے میں حصہ لینے کی بات بھی فضلے سے کی۔" وہ بڑھ چڑھ کر تیاری کر رہا ہے۔"

"وہ تو کرے گا نور محمد۔ آپ کو پتا ہے وہ دوڑ کا شوقین ہے۔"

"میں بھی مقابلے میں حصہ لے رہا ہوں۔"

"اچھی بات ہے۔"

"لیکن۔"

"لیکن کیا چوہدری۔"

"مجھے جیتنا ہے۔"

"آپ جیتیں گے۔"

"کرمے کی شرکت اس جیت کو....."

فضلے اس کی بات سمجھ گیا پھر مسکرایا اور سر نورے کے کان کے قریب کرتے ہوئے سرگوشی کی "اس کی فکر ہی نہ کریں چوہدری۔ فضلے بہت کچھ کر سکتا ہے۔ فکر نہ کریں جیت آپ کی ہی ہو گی۔"

"پکی بات؟"

"بالکل پکی۔"

"اس جیت کے دو فائدے ہوں گے فضلے۔ ایک تو نام روشن ہو گا' دوسرے وہ متنازعہ کھیت بھی مل جائے گا' میں نے کرمے کے ساتھ شرط بدلی ہے۔"

"اچھا؟"

"ہاں۔"

"بس پھر تو سمجھو چوہدری' کھیت آپ کا ہو گیا۔"

"پکا یقین دلاؤ۔"

"آپ فکر ہی نہ کریں جی۔ بس بات مجھ پر چھوڑ دیں۔ پہلی بار تو نہیں نا آزما رہے مجھے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے۔"

"پھر؟"

"کرمے کو شبہ بھی نہ گزرے۔"

"پہلے کبھی گزرا ہے چوہدری۔ کشتیوں کا مقابلہ یاد نہیں کیسے جیتا تھا۔ کرمے کی کشتی میں اس ہوشیاری سے سوراخ میں نے ہی تو ڈالا تھا۔"

"ٹھیک ہے' ٹھیک ہے بس اب بھی تم ہی کچھ کرو گے۔ ہاں' لیکن گھڑ سواری میں تم کیا کر سکتے ہو؟"

"بہت کچھ۔ یہ مجھ پر چھوڑیں۔"

"میں تمہیں خوش کر دوں گا۔"

"سب کچھ تمہی نے دیا ہے چوہدری" بات خاموش ہی سے طے ہو گی۔

جب گھڑ سواری کا مقابلہ شروع ہوا' سات گھڑ سوار بیک وقت گھوڑوں کو ایڑ لگا رہے تھے۔ کرما بہت خوش اور پر امید نظر آ رہا تھا۔ تینوں چاروں گاؤں کے لوگ تماشا دیکھنے آئے ہوئے تھے۔ رنگ برنگے لباس پہن رکھے تھے۔ ڈھول تاشے بجائے جا رہے تھے اپنے اپنے ساتھیوں کی ہمت بندھانے کے لئے پر تحسین الفاظ بہ آواز بلند کہہ رہے تھے۔ کہیں نوجوان بھنگڑا ڈال رہے تھے' کہیں چمٹا بجا بجا کر گانے گا رہے تھے۔ میلے کا سا سماں تھا۔

گھوڑے قدم قدم چلے پھر تیز ہوئے اور دیکھتے ہی دیکھتے ہوا ہو گئے۔ جب تک وہ نظر آتے رہے لوگ تالیاں بجا بجا کر شور مچا مچا کر اس طرف دیکھتے رہے اور جب وہ دھول کے بادلوں کی اوٹ میں نظروں سے چھپ گئے تو لوگوں کی بے تاب نگاہیں اس سمت اٹھنے لگیں جہاں سے گھوڑوں نے متعینہ فاصلہ طے کر کے لوٹنا تھا۔ انتظار کی کیفیت سے دوچار کئی لوگ قیاس آرائیاں کر رہے تھے۔ کئی شرطیں لگا رہے تھے کہ فلاں اول آئے گا اور کئی منتظر تھے کہ فیصلہ ہو اور وہ خوشی سے گاتے ناچتے گاؤں کی گلی گلی میں مژدہ سناتے پھریں کہ ہمارا گاؤں اول رہا۔

وقت گزر رہا تھا۔ دل بے تابی سے دھڑک رہے تھے۔ لوگوں کی نظریں راہ تکتے تھک رہی تھیں۔ گاؤں کی عورتیں منڈیروں پر چڑھ گئی تھیں۔ لڑکیاں' بالیاں چھتوں پر چڑھ کر اول آنے والے شہہ سوار کی راہ تک رہی تھیں۔

www.freepdfpost.blogspot.com

ان میں زینب بھی تھی۔ نورے اور کرمے کے بچپن کے ساتھ کھیلی گول مٹول زینب جو اب گاؤں کی الزنمیار تھی۔ جوانی پر روپ تھا یا روپ پر جوانی' زینب کے حسین چہرے پر نظریں نہ ٹھہرتی تھیں۔ سب بچے ساتھ ساتھ کھیلے تھے۔ تب لڑکی لڑکے کی کوئی قید نہ تھی سب بچے تھے' معصوم بھولے بھالے۔ اپنے جنسی وجودوں سے بے خبر۔ رات رات گئے تک چھپن چھپائی کھیلنا' چھتوں پر چڑھ کر گڈیاں اڑانا' ریت کے ڈھیروں میں پیر گھسا گھسا کر گھروندے بنانا' گلی ڈنڈا کھیلنا اور گڑیوں کا بیاہ رچانا سب مشترکہ کھیل تھے۔

لیکن جوں ہی لڑکپن نے جوانی کی دہلیزیں قریب دیکھیں لڑکیوں لڑکوں کی راہیں آپ ہی آپ الگ ہو گئیں۔ لڑکیاں لڑکوں سے کترانے شرمانے لگیں۔ لڑکے ان کی راہوں میں آنے سے جھجکنے لگے۔ وہ بے تکلفی جاتی رہی اور ایک حد فاصل خود قائم ہو گئی۔ لڑکیاں گاؤں کی عزت بن گئیں اور لڑکے ان عزتوں کے رکھوالے۔ بس یہی ساتھ رہ گیا۔ یہی رابطہ باقی رہا۔

لیکن کچھ بندھن ایسے بھی ہوتے ہیں جو چپکے چپکے بندھ جاتے ہیں۔ وقت کی ڈوری انہیں مضبوط کر دیتی ہے۔ یہ بندھن دوسروں کی نظروں سے پوشیدہ ہوں تو ہوں' اپنی نظروں میں بڑے جانے پہچانے اور جاندار ہوتے ہیں۔ یہ بندھن بے خبری میں لاشعوری طور پر بندھ جاتے ہیں۔ اور جب ان کا شعور ہو' آگہی ہو تو پھر انہیں دل کے نہاں خانوں میں بڑا سینت سینت کر' سنبھال سنبھال کر رکھنا پڑتا ہے کیونکہ پتا نہیں ہوتا یہ مضبوط مگر بے اختیار بندھن وقت اور زمانے کے مزاج پر پورے بھی اترتے ہیں یا نہیں۔

کچھ ایسے ہی بندھن زینب اور کرمے میں بندھ چکے تھے۔ جب وہ ساتھ ساتھ کھیلتے تھے' ان سے آگہی نہ تھی لیکن جب اپنے اپنے دائروں میں سمٹے تو ان کا احساس و شعور شدت سے ہوا۔ تب دونوں ہی کچھ خوفزدہ سے ہو گئے۔ زمانے کے مزاج سے شناسائی ہوئی تو انہوں نے بھی ان بندھنوں اور جذبوں کو دل کے نہاں خانوں میں سینت سینت کر رکھ لیا۔ دونوں نے کبھی ایک دوسرے کے سامنے اظہار کیا نہ بتلایا۔ ملنا ملانا تو دور کی بات تھی' وہ تو کچھ اور بھی کترانے لگے تھے۔ یوں بھی زینب جب سے گھر کی ہو گئی تھی' وہ کبھی کبھار ہی نظر آتی اور جو کبھی آمنا سامنا ہو جاتا تو لبوں پر ایک غیر محسوس مسکراہٹ تھرک جاتی۔ آنکھوں میں خمار

سا اترنے لگتا اور دل بے ترتیبی سے دھڑک اٹھتا۔ کبھی آمنا سامنا بھی ہوتا تو اتنی عجلت میں کہ کوئی بات کئے بغیر ہی وہ آگے بڑھ جاتے۔

لیکن یہ شناسائی اجنبیت ان بندھنوں کو اور بھی مضبوط بنا دیتی۔ دونوں ایک دوسرے سے بیگانہ بنے رہنے کے باوجود ایک دوسرے سے باخبر رہتے۔ ایک خوش ہوتا تو دوسرے کے من میں آپ ہی آپ خوشی کے گرداب پھیلنے لگتے۔ اور ایک کو دکھ پہنچتا تو دوسرا غیر محسوس طریقے سے یہ دکھ اپنے اندر اتارتا چلا جاتا۔ یوں زینب کرمے کے ہر کام سے باخبر تھی۔ اس نے نورے سے جتنے مقابلے کئے تھے' اسے علم تھا۔ مقابلے ہارنے پر جن دکھ اور کرب کی منزلوں سے وہ گزرا تھا' اس نے بھی اسے اچھی طرح محسوس کیا تھا۔ یہ وار اس نے اپنے دل پر سہے تھے۔ اسی طرح زینب کی چھوٹی موٹی خوشیاں اور ننھے منے غم کرمے کے دل پر رقم تھے۔ پچھلے سال جب وہ بیمار ہو گئی تھی تو کرما ہی جانتا تھا کہ سونی اور اکیلی راتیں دکھ کے بار سے کتنی بوجھل ہو جاتی ہیں۔

آج بھی زینب گھڑسواری کا مقابلہ دیکھنے کے لئے اپنی سکھیوں کے ساتھ ماسی رحمتے کے کچے کوٹھے پر چڑھی بیٹھی تھی۔ اس کی نظریں اس راہ پر تھیں جدھر سے سواروں کی آمد متوقع تھی..... وہ دل ہی دل میں کرمے کی جیت کی دعائیں کر رہی تھی لیکن دل ہول بھی رہا تھا۔ کرما نورے سے ہارتا چلا جا رہا تھا۔ آج بھی اگر وہ ہار گیا تو؟ وہ گھبرا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

جینو نے اس کا سرخ سبز دوپٹہ کھینچا "کیوں کیا ہوا؟ بیٹھو نا ابھی تو دیکھنے میں مزہ آئے گا۔ پتا نہیں کون جیتے گا۔ اللہ کرے جیت ہمارے گاؤں کی ہو۔ چاہے چوہدری جیتے چاہے کرم علی۔"

"کرم علی جیتے" زینب نے دل ہی دل میں کہا۔ پھر وہ منڈیر پر جینو کے پہلو میں بیٹھ گئی۔

اسے کسی پل قرار نہیں آ رہا تھا۔ انجانا سا خوف دل میں اتر رہا تھا۔ وہ منڈیر سے مٹی کے چھوٹے چھوٹے روڑے اٹھا اٹھا کر گلی میں پھینک رہی تھی۔ اس کی سنگی سہیلیاں گپ شپ لگا رہی تھیں۔ سب ہی اپنے گاؤں کے شہ سواروں کی جیت کے لئے دعائیں کر رہی تھیں۔ نورے یا کرمے کی ذاتی اور الگ حیثیت ان کے لئے کچھ تھی جو نہیں۔ وہ تو جیت کا سہرا اپنے گاؤں کے نوجوان کے سر دیکھنے کی متمنی تھیں۔

www.freepdfpost.blogspot.com

وقت کے ساتھ ساتھ بے تابی بڑھ رہی تھی۔ لڑکیاں بالیاں اٹھ اٹھ کر ان راہوں پر نظریں بچھا رہی تھیں۔ جن سے سواروں نے آنا تھا۔ کچھ ایڑیاں اٹھا اٹھا کر ہاتھوں کی چھجے آنکھوں پر رکھ کر ادھر تک رہی تھیں۔ یہی حال عورتوں کا بھی تھا۔

ادھر میدان میں بھی لوگ بے تابی سے انتظار کر رہے تھے۔ مقررہ حد تک بانس گڑے تھے۔ اور ان پر ہر گاؤں کے سوار کا خصوصی پرچم لہرا رہا تھا۔ لوگ اچک اچک کر راہ تک رہے تھے۔ قیاس آرائیوں کا بازار گرم تھا۔ اور شرطیں بھرنے کی رفتار تیز ہو گئی تھی۔

پھر اس راستے پر دھول کے بادل اڑتے دکھائی دینے لگے۔ لوگوں میں ہلچل بڑھ گئی۔ عورتیں دروازوں کی دہلیزیں پار کر کے گلی کے سرے پر آ گئیں۔ لڑکیاں چھتوں پر منڈیریں تھام کر کھڑی ہو گئیں۔

دھول کا غبار بڑھ رہا تھا پھر ان گھڑ سواروں کے ہیولے دکھائی دینے لگے۔ دور سے پہچان مشکل تھی کہ کون آگے ہے لیکن فاصلے سمٹے تو ہیولے کچھ واضح ہونے لگے۔ کچھ لوگوں نے اول نمبر آنے والے نورے کا گھوڑا پہچان کر چوہدری نور محمد زندہ بار کے فلک شگاف نعرے لگائے۔ وہ اسی سمت دوڑ پڑے جس طرف سے سوار آ رہے تھے۔ گھوڑے سرپٹ بھاگ رہے تھے۔ مقررہ حد تک آنے سے پہلے ہی لوگوں نے جان لیا کہ نور محمد کا گھوڑا سب سے آگے ہے۔ اس کے چند گز پیچھے شہد پور کے نوجوان باقر علی کا گھوڑا تھا۔ تیسرے نمبر پر جگی اور شاداتھے جو قریبی گاؤں سکھ پور کے جوان تھے۔

سات سوار بھاگے تھے لیکن لوٹنے والے چھ تھے۔ کرمے کا گھوڑا آخر میں بھی نظر نہیں آیا۔ نور محمد جیت گیا تھا۔ میدان میں واہ واکی پکار تھی۔ لوگ بے قابو ہو گئے تھے۔ نورے کو گھوڑے کی پشت سے اچک کر کندھوں پر اٹھا لیا تھا۔ وہ نعرے لگاتے بھنگڑے ڈالتے نور محمد کو اس طرف لا رہے تھے جس طرف اسٹیج بنا ہوا تھا اور انعامات بھی دیئے جانے والے بڑے بڑے کپ رکھے تھے۔

لوگ جوش اور مسرت سے بہک رہے تھے لیکن ایسے میں ہی کرمے کے ساتھی اور حواری پریشان ہو ہو کر پوچھ رہے تھے۔ "کرما نہیں آیا' وہ کہاں رہ گیا؟ کہیں کوئی حادثہ تو پیش نہیں آ گیا؟ اس کا پتا کرو۔ وہ کہاں چلا گیا؟" اور اس کے مقابلہ جیتنے پر لگائی گئی شرطوں والے

ہراساں اور پریشاں ایک دوسرے کو تک رہے تھے۔

ہر طرف کیا کیا ہونے لگی۔ لوگ ایک دوسرے سے استفسار کرنے لگے۔ تب ہی دوسرے نمبر پر آنے والے باقر علی نے بتایا کہ کرمے کے گھوڑے کی باگیں دوسرے میل پر ہی ٹوٹ گئی تھیں۔ گھوڑا بے قابو ہو گیا تھا اور کرما اس کی پشت پر لیٹ کر اس کی گردن میں بازو ڈال کر اسے قابو کرنے کی کوشش کرنے میں دوسری طرف نکل گیا تھا۔ اس کی خاطر وہ چند لمحے رک گیا تھا۔..... وہ رکتا نہیں تو مقابلہ جیت جانا اس کے لئے مشکل نہیں تھا۔

کرما یہ مقابلہ بھی اسی طرح ہار گیا جس طرح کشتی رانی کا مقابلہ ہارا تھا۔ اس کے گھوڑے کی باگیں مضبوط چمڑے کی تھیں۔ لیکن معلوم ہوتا تھا کسی نے ٹوٹنے والی جگہ سے انہیں گھس گھس کر کمزور کر دیا تھا۔ اسی لئے چند میل دوڑنے کے بعد ہی باگیں ٹوٹ کر اس کے ہاتھ میں آ گئی تھیں۔ وہ تو اس کی ہمت دلیری اور گھوڑے کی مزاج آشنائی تھی جو وہ اسے قابو میں کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا ورنہ جس طرح گھوڑا بدکا تھا بدترین حادثہ بھی پیش آ سکتا تھا۔

رات کرمے کے گھر لوگوں کے ٹھٹھ کے ٹھٹھ جمع تھے۔ لوگ اس حادثے کی وجہ جاننے کو بے تاب ہو رہے تھے۔ جن لوگوں نے اس کے اول آنے کی شرطیں باندھی تھیں وہ غصے سے لال پیلے ہو ہو کر ان انجانے ہاتھوں کو کوس رہے تھے جنہوں نے باگیں گھس گھس کر کمزور کر دی تھیں۔ جو گھوڑے کے زور پکڑنے پر ٹوٹ گئی تھیں۔

کرما نڈھال تھا۔ اس کے من میں غم اور غصے سے ابال اٹھ رہے تھے۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ یوں ٹھگی کرنے والے کا گلا دبوچ ڈالے اور لوگوں کے ساتھ نورا بھی اس کے گھر آیا تھا..... اس نے کمال محبت سے اسے اپنے ساتھ لپٹا لیا تھا اور ہمدردی جتاتے ہوئے بولا تھا "دیکھ کرمے۔ اس جیت کو میں اپنی جیت نہیں سمجھتا۔ تو حادثے سے دوچار نہیں ہوتا تو تیری جیت یقینی تھی۔ اب بھی میں کہوں گا کہ جیتا تو ہے میں نہیں۔"

کرمے نے بے دلی سے کہا "دوست کی جیت میری ہی جیت ہے نورے۔ تمہیں مبارک ہو۔"

"مبارک کے مستحق تم ہو۔"

www.freepdfpost.blogspot.com

"ہاں ٹھیک ہے۔ تم میرے دوست ہو۔ تم سے یہی امید تھی۔" کرمے نے نورے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر یہ بات کہی تو اس نے کترا کر منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ کرمے کے لئے یہ جاننا مشکل نہ تھا کہ ساری افتاد کا محرک نورا ہی ہے۔ کچھ اور نشان بھی اسے ملے تھے لیکن نورا جس خلوص اور محبت کا اظہار کر رہا تھا' کرمے کی زبان کھل نہ پا رہی تھی۔ ہار دل میں گرہ سی ضرور بیٹھ گئی تھی نورے نے سب لوگوں کے سامنے یہاں تک کہہ دیا کہ اپنی شرط سے بھی دستبردار ہو رہا ہے۔

"کرمے' مقابلہ ہونے کی صورت میں شرط جیتنے ہارنے کا سوال ہوتا ہے۔ جب میں سمجھتا ہوں کہ اس منحوس حادثے کی وجہ سے تمہارا مقابلہ ہوا ہی نہیں تو پھر شرط بھی گئی۔ زمین میں نہیں لوں گا۔"

لوگ اس کی دریا دلی' خلوص اور کرمے کے لئے دوستی کے جذبوں کی شدت سے بڑے متاثر ہوئے لیکن کرما مطمئن نہ ہو سکا..... وہ اندر ہی اندر جز بز ہوتا رہا۔ اس شکست نے اسے چور چور کر دیا تھا۔ وہ کئی دن نڈھال رہا۔ ماں ہمت بندھاتی' دوست یاروں نے حوصلہ دیا' نورا تسلی دلاسے دیتا رہا لیکن وہ پژمردہ ہی رہا..... اسے ان ہاتھوں کی کھوج تھی جو نورے کے ایما پر اس کی شکست اور تباہی کا باعث بنتے تھے۔ کشتیوں کے بعد اب گھڑسواری کا مقابلہ ہارنا اس کی برداشت سے باہر تھا۔

کئی دن گزر گئے وہ سنبھل نہیں پایا' وہ اکثر کھیتوں کی منڈیروں پر بیٹھا سوچوں میں گم رہتا۔ کبھی گھنے درختوں تلے بے قرار روح کی طرح گھومتا پھرتا' وہ سوچتا رہتا کہ نورا ایسا کیوں کرتا ہے' اپنی بڑائی اور برتری ثابت کرنا چاہتا ہے' اسے نیچا دکھا کر خوش ہوتا ہے' اسے نقصان پہنچا کر مطمئن ہوتا ہے؟ کیوں؟ کیا اس کی بچپن کی دوستی صرف نمائشی ہے' وہ دل کا نہیں' اس کے خلوص میں کھوٹ ہے؟ کیا وہ واقعی دوست نما دشمن ہے؟

اس دن بھی وہ ایک گھنے پیڑ تلے کھیس کی بکل مارے بیٹھا تھا..... اسے کچھ ثبوت ملے تھے کہ فضلے نے اس کے گھوڑے کی باگوں کو کمزور کیا تھا۔ اور یہ اس نے نورے کے اشارے پر کیا تھا۔ اسے دکھ ہوا تھا اور دل میں ابال سے اٹھ رہے تھے۔

وہ اپنے لائحہ عمل کے متعلق سوچ رہا تھا کہ پشت کی طرف سے ایک نسوانی

آئی۔ یہ آواز وہ بڑی آسانی سے پہچان سکتا تھا کہ یہ ترنم' رس اور یہ نقرئی گھنٹیوں کی سی جھنکار صرف اور صرف زینب ہی کی آواز میں تھی' لیکن وہ اس وقت یہاں کہاں؟ اس نے جلدی سے گردن گھما کر دیکھا۔ چوڑے تنے والے درخت کے ساتھ لگی وہ زینب ہی تھی جس نے کالی چادر میں اپنا وجود چھپا رکھا تھا اور اس کا چاند سا چہرہ سیاہ چادر کے کناروں میں دمک رہا تھا۔

"تم..... تم زینے" وہ ایک دم اٹھتے ہوئے بے ساختہ کہہ اٹھا۔

"کرمے۔ تم اس طرح ڈھے گئے ہو۔ مجھے اس بات سے بہت دکھ ہے۔" وہ ہولے سے بولی۔

"تو..... تو کیا کروں؟"

"ہار مان گئے ہو؟"

"زینے۔ مجھے بیری بجن نے مار ڈالا۔"

وہ چند لمحے رکی۔ پھر ہولے سے بولی "اس کا مقابلہ کرو کرمے۔ وہ تم پر اور طرح بھی وار کرنے والا ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"وہ..... وہ اپنی ماں کو ہمارے..... گھر..... بھیجنے والا ہے کرمے۔ تم ڈھے گئے تو وہ تمہیں روند ڈالے گا۔"

کرما چند لمحے تو کچھ نہیں سمجھا پھر بے اختیار بولا۔ "اپنی ماں کو تمہارے گھر کیوں بھیج رہا ہے؟"

وہ منہ موڑتے ہوئے بولی "جوان بیٹے کی ماں لڑکی والوں کے گھر....."

"نہیں' نہیں۔"

زینب قدم اٹھاتے ہوئے بولی "میں سمجھ نہ پا رہی تھی کہ تمہیں کیسے پیغام بھیجوں' شکر ہے آج تم یہاں مل گئے۔"

"زینے۔" وہ تیز الفاظ میں بولا۔

"ہتھیار نہیں ڈالو۔ ڈھے گئے تو روندے جاؤ گے۔ میرے ماں باپ شاید پنڈ کی

www.freepdfpost.blogspot.com

چوہدرانی کو انکار نہ کر سکیں۔ جو کرنا ہے پہلے کر لو۔"

کرمے کا جواب سنے بغیر وہ تیزی سے آگے بڑھ گئی۔ کرما پریشان پریشان سا کھڑا رہ گیا' لیکن جلد ہی وہ سنبھلا۔ اس کی مٹھیاں بھنچ گئیں' آنکھیں شعلے اگلنے لگیں اور وہ دانت پیستے ہوئے غرایا "نہیں یہ بازی تمہیں نہیں جیتنے دوں گا نورے۔ تم یہ جانتے ہوئے بھی کہ زینب میرے لئے کیا ہے' میری راہوں میں آنے لگے' میں تمہیں پیس کے رکھ دوں گا۔" وہ تیز تیز قدموں سے گھر کی طرف چل دیا۔

جب رات اتر آئی' سردیوں کے ٹھٹھرے آسمان پر ستارے ٹمٹمانے لگے' ٹھنڈی ہوا کھیتوں میں سرسرانے لگی اور کوٹھڑیوں کے بند کواڑوں کے اندر سے ٹمٹماتے دیوں کی روشنی کانپتے ہوئے' درزوں سے جھانکنے لگی' دن بھر کے تھکے ہارے لوگ لحافوں میں دبک گئے تو کرما اپنے بستر سے نکل کر صاحباں کے پاس آ گیا۔

"ماں۔" اس نے چارپائی کی پٹی پر بیٹھتے ہوئے اس کا سوتی لحاف قدرے کھینچا۔

"کیا ہے کرمے؟" وہ بولی۔

"جاگ رہی ہو نا؟"

"لیٹی تھی' سونے کو تھی۔ کیوں کیا بات ہے اس وقت کیا کہنے آئے ہو؟"

"ماں!"

"ہوں۔ کہو کوئی خاص بات ہے؟"

"ہاں ماں۔"

"کہو" وہ دوپٹے کی بکل مارتے ہوئے بستر میں اٹھ بیٹھی۔ کرما اپنی گود میں ہاتھ رکھے اس کے قریب پٹی پر بیٹھا تھا "وے کرمے کیا بات ہے؟" وہ اس کا کندھا ہلاتے ہوئے بولی۔

کرما اس کی طرف دیکھ کر دھیرے سے مسکرایا۔ پھر سر جھکاتے ہوئے بولا۔ "ماں! میں جوان ہوں تو ماؤں کو فکر سے نیند نہیں آتی۔ گھر گھر لڑکیاں تلاش کرتی پھرتی ہیں۔ ایک تو۔ کہ....."

ماں ہنس پڑی "تو تو اپنے بیاہ کی بات کرنے آیا ہے اس وقت۔"

"پوچھنے آیا ہوں کہ تمہیں میری فکر ہے بھی یا نہیں۔"

"اے ہے' میں تو ڈر ہی گئی تھی۔" صاحباں تکیے سے ٹیک لگاتے ہوئے ہنسی۔

"ماں۔"

"ہاں۔"

"کوئی لڑکی دیکھی ہے؟" اس نے جان بوجھ کر کہا' جانتا تھا کہ ماں زینب کو بہت پیار کرتی ہے۔

دیکھی تو تھی۔ صاحباں قدرے سنجیدہ ہو کر بولی۔

"تھی کیا مطلب؟" وہ بے تابی سے بولا۔

"چندا۔" اس نے پیار سے بیٹے کے خوبصورت چہرے کو دیکھا۔ "زینے کو میں نے شروع ہی سے تمہارے لئے پسند کیا ہوا تھا مگر اب.....!"

"پھر اب.....اب کیا ہوا؟"

"اب چوہدرانی اسے نورے کے لئے مانگنا چاہتی ہے۔ کل ہی وہ کہہ رہی تھی.....کہ رشتہ لے کر زینے کی ماں بیگماں کے پاس جائے گی۔ اب چوہدرانی جب یہ بات کہہ چکی ہے ہم لوگ کیسے یہ بات کاٹ سکتے ہیں۔ پہل اس نے کر لی۔"

"نہیں ماں۔"

"کرمے۔"

"پہل ہم نے کرنی ہے ماں۔ تم کل ہی میرا رشتہ لے کر ان کے ہاں جاؤ گی۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ چوہدرانی نے خود مجھ سے بات کی ہے۔ میں' میں کیسے.....اب جا سکتی ہوں۔ کرمے! یوں نہیں ہو سکتا۔ چوہدرانی تو تیاریوں میں مصروف ہے۔ ہم لوگ اس سے ٹکر لینے سے تو رہے۔ ہاں اس نے بات نہ کی ہوتی تب بات اور تھی۔"

"بات اب بھی اور ہے ماں۔" کرمے نے غصے سے اٹھتے ہوئے کہا۔

"بچوں کی سی باتیں نہ کر کرمے' ہم لوگ اس نے متھا نہیں لگا سکتے' ان کے مقابلے میں نہیں آ سکتے۔ وہ پیسے والے لوگ ہیں.....پنڈ کے چوہدری۔ شنوائی انہی کی ہو گی۔ ہم ان کے مقابلے میں اترے بھی تو کیا ہو گا۔ بیگماں تو پہلے ہی چوہدرانی کی سکھی سہیلی ہے۔ یہ رشتہ ان کے بخت کھول دے گا۔ ہم ان کے مقابلے میں نہیں آ سکتے کرمے' نہیں آ سکے۔"

www.freepdfpost.blogspot.com

صاحباں بول رہی تھی لیکن کرما اٹھ کر جا چکا تھا۔

صبح پھر ماں بیٹے میں یہی بات چھڑی۔ کرما بضد تھا کہ چوہدرانی کے رشتہ لے کر جانے سے پہلے صاحباں کرمے کے لئے زینب کو مانگ لے۔ کرمے نے ڈھکے چھپے لفظوں میں اپنی اور زینب کی بے ضرر سی چاہت کا بھی ذکر کر دیا۔

لیکن صاحباں نے اس بات کو کوئی اہمیت نہیں دی۔ سوال چوہدرانی کا تھا۔ وہ اس سے بات کر چکی تھی۔ اب وہ کسی اچھے سے کا انتظار کر رہی تھی۔ اس نے نورے کی پسند کا بھی اسے بتایا تھا۔ اب بھلا صاحباں کوئی قدم اٹھاتی تو کیسے؟ وہ تو پریشان ہو گئی' کرما اپنی بات پر اڑا ہوا تھا اور اس کے تیور بتا رہے تھے کہ وہ اپنی بات سے ٹلے گا نہیں۔

وہ اٹھ کر چلا گیا تب بھی صاحباں پریشان سوچوں میں گھری رہی' وہ کیا کرے' کچھ سمجھ نہ پا رہی تھی۔

ایک دو دن کرما ماں سے ہی الجھتا رہا۔ اسے پہل کرنے کو کہتا رہا۔ صاحباں کبھی سن کر چپ ہو جاتی' کبھی اسے سمجھاتی بجھاتی۔ لیکن معاملہ تو کرمے کی سمجھ سے باہر تھا اور جب وہ بہت بگڑا' بہت ضد کی' بہت بھڑکا تو صاحباں جھلا کر بولی۔ "شروع ہی سے تم دونوں متھا لگا لیتے ہو' مجھ سے تو کچھ نہیں ہو سکتا۔ نہ ہی میں چوہدرانی کی خفگی مول لے سکتی ہوں۔ اس کے احسانوں سے ہم دبے پڑے ہیں۔ میں احسان فراموش بن بھی جاؤں تب بھی کچھ نہیں کر سکتی۔"

"ساری عمر تم مجھے ان احسانوں سے دباتی آ رہی ہو ماں۔"

کرما غصے سے بولا۔ "نورے کی ہر زیادتی کے سامنے میں صرف اسی وجہ سے دب گیا لیکن اب ایسا نہیں ہو گا' نہیں ہو سکتا۔"

"تو جا' دوست ہے تیرا' اسی سے مل کر کوئی فیصلہ کر لے۔ اسے اپنے حق میں دستبردار ہونے پر مجبور کر لے یا خود اس کے حق میں دستبردار ہو جا۔ ماں باپ کو بیچ میں نہ گھسیٹو۔"

"ٹھیک ہے۔" کرمے نے نہ جانے کیا سوچ کر سر ہلایا۔

پھر اسی شام وہ نورے کی بیٹھک میں بیٹھا اس سنجیدہ اور انتہائی نازک موضوع پر بات کر رہا تھا۔

"نورے! تم اچھی طرح سے جانتے ہو کہ زینب میرے لئے کیا ہے۔"

"اور شاید تم نہیں جانتے کہ وہ میرے لئے کیا ہے۔"

"تم نے کبھی اشارتاً بھی اس بات کا ذکر نہیں کیا تھا۔"

"بات دل میں چھپا کر رکھی تھی میں نے وقت آیا تو ماں پر ظاہر کر دی۔"

زینب میری ہے۔

"غراؤ نہیں کرمے۔ یہی بات میں بھی کہتا ہوں۔"

"کس بنا پر؟ کیا زینب سے تمہاری کبھی کوئی بات ہوئی؟"

"اس کی ضرورت کیا ہے۔ میں پنڈ کا چودھری ہوں۔ جو چیز پسند آ جائے اسے حاصل کر لیتا ہوں۔"

"نورے' تو چوہدری ہو یا کچھ اور لیکن یہ بات ذہن نشین کر لو۔ میں تمہیں اس سلسلے میں من مانی نہیں کرنے دوں گا۔"

"بک بک مت کر۔" نورے نے اس کا اٹھتا ہاتھ پکڑ لیا "میں بڑے تحمل سے برداشت کر رہا ہوں کہ تو میرے بچپن کا یار بیلی ہے۔"

"ہونہہ یار بیلی۔"

دونوں میں تو تو میں میں ہونے لگی۔ کرمے کے اندر ہی اندر جو شیلے غبار اٹھ رہے تھے۔ اپنی ساری شکستوں اور ہاروں کا دکھ اذیت دے رہا تھا۔ اس کی آنکھوں سے شعلے برس رہے تھے اور وہ خونخوار نظروں سے نورے کو تک رہا تھا۔

نورا اس سے خوفزدہ ہرگز نہیں تھا۔ اس کے جوش اور غیظ و غضب پر وہ تمسخرانہ ہنس رہا تھا اور یہ ہنسی' یہ تحقیر آمیز ہنسی کرمے سے برداشت نہ ہو سکی۔ وہ اس پر پل پڑا۔ نورا بھی کچھ کم نہیں تھا۔ وہ بھی اس پر جھپٹ پڑا اور دونوں ایک دوسرے کو گالیاں بکتے' گتھم گتھا ہو گئے۔ بالکل اسی طرح جس طرح بچپن میں ہو جایا کرتے تھے۔ وہ شاید لاتوں اور گھونسوں سے ایک دوسرے کو ادھ موا کر دیتے کہ اسی وقت بچپن کے یار کا فضلے' امجد اور منا بیٹھک میں آ گئے۔ وہ حسب معمول گپ شپ لگانے آئے تھے۔ دونوں کو یوں گتھم گتھا دیکھا تو جلدی سے آگے بڑھے۔

www.freepdfpost.blogspot.com

"کیا ہو رہا ہے بھئی؟"

"پاگل تو نہیں ہو گئے۔"

"بچے تو نہیں ہو اب۔"

"حد ہو گئی۔"

"بری بات' دوست ہو کر اس طرح لڑ رہے ہو۔"

چاروں نے بڑی مشکل سے دونوں کو الگ کیا' دونوں کے بال منتشر تھے' چہرے لال بھبوکا اور سانس پھولی ہوئی تھی۔ نورے کے ہونٹ سے خون نکل رہا تھا اور کرمے کی گردن پر خراش آئی تھی۔

دونوں کو دوستوں نے تھام رکھا تھا لیکن وہ اب بھی گالیاں بکتے ہوئے ایک دوسرے کو کھا جانے والی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ طیش میں آئے ہوئے تھے' مارنے کی دھمکیاں دے رہے تھے۔

"میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔"

"تمہاری موت تمہیں للکار رہی ہے۔"

"خون کی ندی تیر کر ہی تم کچھ کر سکو گے۔"

"میں ریوالور کی ساری گولیاں تمہارے سینے میں اتار دوں گا۔"

"میں تمہاری بوٹیاں کر کے چیلوں کو ڈالوں گا۔"

دوست بیلی انہیں بمشکل قابو کئے ہوئے تھے۔ وہ حیران تھے کہ دونوں پر ایسی کون سی افتاد آن پڑی ہے جو وہ اس طرح خونخوار ہو رہے ہیں۔ دوستی کا لحاظ رہا ہے نہ ہمسائیگی کا۔ اور تو اور دوستوں کے آجانے سے بھی وہ چپ نہیں ہو رہے۔

دونوں کو رام کرنے میں دوستوں کو ایڑی چوٹی کا زور لگانا پڑا..... گھنٹا بھر وہ کبھی کرمے اور کبھی نورے کی منت سماجت کرتے رہے۔ جب دونوں قدرے اپنے آپ میں آئے۔ تو فضلے نے نورے کو تخت پر بٹھا دیا اور امجد نے کرمے کو کرسی پر دھکیل دیا۔

"اب بتاؤ کیا بات ہوئی ہے؟" فضلے نے پوچھا۔

"دوست ہو کر اس طرح لڑ رہے تھے۔" امجد بولا۔

"یہ بات ہم سب کے لئے باعث ذلت ہے۔" کاکا کہہ اٹھا۔

"بھئی ہمیں تو تمہاری دوستی پر ناز ہے۔" منا بولا "مثالیں دی جاتی ہیں۔"

"اسی دوستی نے ہمارے گاؤں کا نام روشن کیا ہے۔ دوسرے گاؤں والے حیران ہوتے ہیں۔ فضلے نے کہا "گھڑ سواری کا مقابلہ جیت کر بھی جس طرح چوہدری نور محمد نے فراخ دلی کا ثبوت دیا ہے۔ لوگ آفرین کہتے ہیں کہ دوستی ہو تو ایسی۔"

کرمے نے بدک کر کچھ کہنا چاہا لیکن کاکا نے اسے روک دیا..... سارے دوست نورے اور کرمے کی بے مثال دوستی کی باتیں کرتے ہوئے اس جھگڑے کا سبب پوچھنے لگے لیکن ان کے پرزور اصرار کے باوجود نہ تو نورا کچھ بتا رہا تھا نہ ہی کرما۔ دوستوں کی پریشانی بڑھ رہی تھی۔

"کچھ تو ہے۔" آخر امجد نے کہا۔ "ہم سب بچپن کے ساتھی ہیں۔ ہم پوچھے بغیر نہیں رہیں گے۔ آخر ہم سے تم دونوں کیوں چھپا رہے ہو۔ اعتماد نہیں ہم پر۔ بھروسا نہیں کر سکتے۔"

ہر ایک نے اپنی محبت خلوص اور اپنائیت کا احساس دلا دلا کر ان سے پوچھا اور جب انہیں تنازعے کی وجہ معلوم ہوئی تو وہ دنگ رہ گئے۔

ان دونوں میں بچپن ہی سے مقابلہ ہوتا چلا آیا تھا لیکن یہ بات تو ان کے وہم سے بھی کوسوں دور تھی۔ زینب بچپن میں ہمیشہ کرمے کی طرف داری کیا کرتی تھی لیکن جب سے وہ گھر کی چار دیواری میں مقید ہوئی تھی کسی کے علم میں نہ تھا کہ وہ کرمے کے بارے میں کیا رائے رکھتی ہے؟ اس کا رجحان کرمے کی طرف ہے بھی یا نہیں' نہ ہی نورے کے متعلق کسی کو علم تھا کہ وہ چاہت کی ڈوریاں زینب سے باندھے ہوئے ہے۔

ایکا ایکی یہ طوفان اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کہے کیا کرے؟ لیکن اس معاملے کو نمٹانا بھی ضروری تھا۔ ابھی بات آپس میں تھی' بڑوں تک نہیں پہنچی تھی' بات پھیلی نہیں تھی۔ پھیلنے سے جو رسوائی زینب کا مقدر بنتی اس سے سب ہراساں تھے۔ اسی لئے وہ سب دونوں کو معاملہ آپس میں طے کر لینے پر اکسانے لگے۔

کبھی وہ نورے سے کہتے۔ "تم ہی دوست کی خاطر راہ سے ہٹ جاؤ۔" اور کبھی کرمے

www.freepdfpost.blogspot.com

کو منانے کی کوشش کرتے "ایک نہ ایک کو تو دستبردار ہونا ہی ہے' تم ہی نورے کی خاطر دستبردار ہو جاؤ۔"

لیکن وہ دونوں اڑے ہوئے تھے' راہ سے ہٹنے کا سوال ہی نہ تھا۔ وہ تو مرنے مارنے پر تلے ہوئے تھے۔ معاملہ بے حد سنجیدہ' گھمبیر اور پریشان کن تھا۔ دوست منتیں کر کر کے ہار گئے۔ ہاتھ جوڑ جوڑ کر دوستی کے واسطے دیے۔ تماشا نہ بننے کے لئے استدعائیں کیں۔ دوستی کا پاکیزہ اور بے لوث جذبہ اکسانے کی کوشش کی لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوئے۔ کوئی بھی اپنا موقف تبدیل کرنے پر آمادہ نہ ہو سکا بلکہ بڑھ بڑھ کر ایک دوسرے کو ختم کرنے کی دھمکیاں دے رہے تھے۔ دوست بے چارے علحدہ پریشان تھے۔

رات خاصی اتر آئی تھی' گلی میں کتے بھونکنے لگے تھے اور دروازوں کے کواڑ بند ہو چکے تھے' باہر سناٹا تھا اور بیٹھک کے اندر وقفوں سے سناٹا پھیل رہا تھا۔ کبھی سب اونچی آوازوں میں بولنے لگتے اور کبھی مہیب سناٹا چھا جاتا۔

امجد نے جب دونوں کو پتھر کی سلوں کی طرح گڑے دیکھا تو بہت سوچنے کے بعد بولا۔

"یار تم لوگ ہمیشہ آپس میں فیصلہ کر لیا کرتے ہو۔ اب بھی کر لو' شرط بدلو' سکہ پھینک لو' پنجہ لڑا لو' اب کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی ہے' زینب ایک ہے تم دو۔ تم میں سے ایک کو تو ہتھیار ڈالنے ہی ہیں۔ یوں ہی پیچھے ہٹنے میں سبکی سمجھتے ہو تو مقابلہ کر لو۔"

"یہ بات ٹھیک کہی تم نے۔"

"واقعی! فیصلہ صرف اسی طور ہو سکتا ہے۔"

"اس سے عزت بھی رہ جائے گی دوستی کی۔""

"اور کوئی راہ نہیں' عقل مندی یہی ہے کہ آپس میں مقابلہ کر کے فیصلہ کر لیں۔"

سب بڑھ چڑھ کر باتیں کرنے لگے۔ نورا اور کرما کچھ نہیں بولے۔

"کہو منظور ہے مقابلہ' جرات مندی سے اقرار کرو' صرف یہی راہ ہے ورنہ دونوں میں سے ایک کی جان جائے گی جو ہم لوگوں کو کبھی بھی منظور نہیں ہو گا۔" وہ سب انہیں سمجھاتے اور مقابلے پہ اکسانے لگے۔

دونوں نے اقرار کیا نہ انکار۔ کاکا اکتا کر بولا "تم دونوں ہی بزدل ہو۔ ہمت ہے تو

مقابلے پہ آؤ۔"

"ہم بزدل نہیں ہیں۔" نورا اور کرما بیک وقت بولے۔

"تو پھر فیصلہ کرو مقابلہ کرنے کا۔" امجد بولا۔

"منظور ہے۔" کرمے نے دانت پیسے۔

"مجھے بھی منظور ہے۔" نورا غصے سے بھڑکا۔

سب قدرے مطمئن نظر آئے' پھر سب مقابلے کی تجویزیں پیش کرنے لگے۔

"سکہ پھینک لو۔"

"پنجہ لڑا لو۔"

"دوڑ لگا لو۔"

"گھوڑے دوڑا لو۔"

لیکن نورا اور کرما دونوں ہی نے ان معمولی مقابلوں کو رد کر دیا۔ گھڑسواری کے نام پر تو کرمے کی آنکھوں سے شعلے نکلنے لگے اور اس نے طنزیہ ہنکارا بھی بھرا۔

"تو اور کیا کرو گے۔" امجد نے پوچھا۔

"ریوالور چلائیں گے ایک دوسرے پر۔" نورا غرایا۔

"نہ بابا۔" کاکے نے جلدی سے کہا۔ "جو بیک وقت دونوں کو گولیاں لگ گئیں تو؟ ایک کو راستے سے ہٹنا ہے دونوں کو نہیں۔"

"یوں کرو زینب کا دوپٹہ جو سر راہ اچک لے وہی جیتا۔" فضلے نے کہا۔

"خبردار۔" کرما چنگھاڑا "ایسا بیہودہ مقابلہ! دوپٹہ صرف زینے کا نہیں گاؤں کی عزت ہے۔ ایسا فضول خیال تمہارے شیطانی ذہن میں آیا کیسے!" فضلے نادم سا ہو گیا۔ سب ایک بار پھر چپ ہو گئے۔

"تو پھر یوں کرو۔" امجد لمبی خاموشی کے بعد بولا۔

"کیا؟" سب دوستوں نے اسی طرف دیکھا۔

"ہمارے ساتھ والے گاؤں شمد پور میں جب کوئی ایسی اڑچن آن پڑے نا' تو عجیب و غریب مقابلہ ہوتا ہے۔"

www.freepdfpost.blogspot.com

"وہ کس طرح؟"

"سانپ ڈسوایا جاتا ہے۔"

"ہاں ہاں' میں نے بھی سن رکھا ہے۔ ایک ڈبے میں سانپ ڈال کر اس میں دو سوراخ کروائے جاتے ہیں۔ دونوں فریق اس میں ایک ساتھ انگلی ڈالتے ہیں۔ جسے سانپ ڈس لے وہ ہار گیا اور...." منے نے کہا۔

"بڑی خطرناک بات ہے۔"

"لیکن فیصلہ تو ہو جاتا ہے۔ سانپ زیادہ زہریلا نہیں ہوتا ہوگا! جبھی تو جسے ڈستا ہے وہ مرتا نہیں۔ سپیرا فوراً ہی زہر چوس لیتا ہے۔"

"میں نے بھی اس بارے میں سنا ہے۔"

نورے کے چہرے پر کچھ گھبراہٹ سی دکھائی دی لیکن کرمے کی آنکھوں میں چمک لہرائی اور وہ جلدی سے اٹھتے ہوئے بولے۔

"مجھے منظور ہے یہ مقابلہ۔"

نورے کو بھی بادل ناخواستہ ہامی بھرنا پڑی۔ پھر وہ سب دن اور وقت کا تعین کرنے لگے۔ شہد پور جا کر ساری معلومات اکٹھی کرنے کا بھی پروگرام بنا اور جگہ کا بھی تعین ہوا۔

کرما بڑے اطمینان سے ہر بات پر صاد کر رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں فاتحانہ سی چمک تھی' ہونٹوں پر کھلتی مسکراہٹ میں میدان مار لینے والی چمک تھی۔ البتہ نورے کا چہرہ دھواں دھواں تھا۔ لگتا تھا وہ اس مقابلے کے لئے ذہنی طور پر تیار نہیں لیکن مسئلہ انا کا تھا۔

جب سب دوست اور کرما پورا پلان مرتب کرنے کے بعد اپنے اپنے گھروں کو سدھار گئے تو فضلے نورے سے بولا۔ "چوہدری اس مقابلے میں کوئی ہیرا پھیری نہیں ہو سکے گی۔ منٹ میں ہار جیت کا فیصلہ ہو جائے گا۔ تم نے ہامی کیوں بھر لی تھی۔ کوئی اور مقابلہ بھی ہو سکتا تھا۔"

نورا بے قراری سے ٹہلتے ہوئے بولا "جو ہو گیا سو ہو گیا۔ اب یہ سوچو کہ مقابلہ کیسے جیتنا ہے؟"

فضلا سر ہلاتے ہوئے بولا۔ "ہار جیت تو اب جس کا مقدر ہے اسے ملے گی۔ ہاں میں

اتنا ضرور کروں گا کہ تم سانپ کے زہر سے محفوظ رہ سکو۔ انگلی پر کوئی ایسی تریاق چیز لگانا پڑے گی۔"

نورا سوچ میں پڑ گیا۔ بولا۔ "اس سے تو زہر جسم میں سرایت کرنے کی بچت ہو سکتی ہے لیکن جیت؟"

"وہ تو مقدر پر چھوڑنا پڑے گی چوہدری۔" "اب سانپ کو تو جل نہیں دیا جا سکتا' نہ ہی سمجھایا جا سکتا ہے کہ وہ کرمے ہی کی انگلی کو کاٹے۔"

دونوں کافی دیر تک یہی باتیں کرتے رہے۔ مقابلے کے دن کرمے کے سوا ہر کوئی گھبراہٹ کا شکار تھا۔ گاؤں سے باہر ایک مٹی کی دیوار اور گری ہوئی چھتوں والے مکان میں جمع ہوئے تھے.... نورے' کرمے اور چاروں دوستوں کے سوا اور وہاں کوئی نہیں تھا۔ سپیرا سانپ والا ڈبا لے آیا۔ اس ڈبے کی چھت میں دو سوراخ تھے۔ جس میں دونوں مقابلہ کرنے والوں نے بیک وقت انگلیاں ڈالنا تھیں۔

سپیرا ڈبا رکھ کر پرے ہٹ کر دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا۔ امجد' کاکے' منے اور فضلے نے ڈبے کو چاروں طرف سے دیکھا۔ پھر کرمے اور نورے کو آمنے سامنے کھڑا کرتے ہوئے کہا۔

"اب بھی وقت ہے دوستو۔ فراخدلی کا مظاہرہ کرو اور کوئی ایک دوسرے کے حق میں دستبردار ہو جائے۔"

"ناممکن۔" کرما جو اپنے دونوں ہاتھ واسکٹ کی جیبوں میں ڈالے مطمئن کھڑا تھا' تیزی سے بولا "مقابلہ ہو گا۔" نورے کو بھی اس کی بات پر طیش آ گیا۔ حفظ ماتقدم کے طور پر اس نے فضلے کا لایا ہوا وہ سفوف انگلی پر مل رکھا تھا جو زہر کو تیزی سے جسم میں سرایت کرنے سے روکنے والا تھا۔

"ٹھیک ہے۔" امجد بے انتہا سنجیدہ تھا۔

"ہم ایک دو تین کہیں گے۔" کاکا بولا۔ "تین پر تم دونوں اپنی اپنی انگلی سوراخ میں ڈال دو گے۔"

"ٹھیک ہے۔" دونوں آمنے سامنے آتے ہوئے بولے۔ ڈبا ان کے درمیان پڑا تھا۔

فضا بڑی بوجھل ہو گئی تھی۔ [illegible] گھبراہٹ سے چہروں کے رنگ فق تھے' صرف

www.freepdfpost.blogspot.com

کرا ہی تھا جو بڑے اطمینان سے جیبوں میں ہاتھ دیے کھڑا تھا۔

کاکے نے ایک بار پھر مصالحت کی اپیل کی لیکن دونوں نے ماننے سے انکار کر دیا۔

"اچھا۔ تمہاری مرضی' ایک بات دونوں ذہن نشین کر لو۔ ظاہر ہے دونوں میں سے ایک ہارے گا۔"

"ہاں۔"

"اسے اپنی ہار دل سے قبول کرنا ہو گی۔ اس مقابلے کے بعد ہنسی خوشی جیتنے والے کو مبارک باد دینا ہو گی۔ فیصلے کو دل سے تسلیم کرتے ہوئے دوستی کو برقرار رکھا جائے گا اور جیتنے والے کی خوشی میں پورے خلوص اور نیک نیتی سے حصہ لینا ہو گا۔" امجد نے تفصیل بتائی۔

"بے شک بے شک۔" سب ہی نے کہا۔

"تو لو میں گنتا ہوں۔" اس نے کہا اور پھر ایک۔ دو۔ اور تین گنا۔

کرمے نے جیب سے ہاتھ نکالا اور انگلی سوراخ میں ڈال دی..... اسی طرح نورے نے بھی سوراخ میں انگلی ڈال دی۔

سب دم بخود تھے کہ دوسرے ہی لمحے نورے کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ سانپ نے اسے ڈس لیا تھا۔ خوف سے اس کا چہرہ سفید پڑ گیا۔ دوستوں نے جلدی سے اسے چارپائی پر لٹا دیا اور سپیرا لپک کر اس کی طرف آ گیا۔ چند لمحوں بعد کرمے نے اپنا کھینچ لیا۔ وہ جیت گیا تھا۔ وہ اطمینان سے قدم اٹھاتا نورے کی طرف آیا جس نے تکلیف کے باوجود اسے مبارک باد دی۔ سب دوستوں نے بھی جیتنے کی مبارک باد پیش کی۔ کرما شان استغنا سے کھڑا تھا۔ یوں جیسے اسے جیت کی پہلے سے خبر تھی اور یقین تھا۔ اسے واقعی اس فتح یابی کا یقین تھا' خبر تھی۔

اس نے مسکراتے ہوئے اپنی واسکٹ کی جیب ہولے ہولے تھپتھپائی جس میں موی لفافے میں برف کی چھوٹی چھوٹی ڈلیاں تھیں اور جن کے درمیان اس نے گھنٹا بھر سے اپنی انگلی رکھی ہوئی تھی۔ انگلی برف کا ٹکڑا بن چکی تھی۔

یہ انگلی اس نے بے دھڑک سوراخ میں ڈال دی تھی۔ کیونکہ اسے علم تھا سانپ یخ کو نہیں ڈستا۔ گرم شے پر لپکتا ہے' گرم شے کو ڈستا ہے اور یہ گر اسے زینب نے بتایا تھا۔

کرمے نے نورے کی ساری زیادتیوں اور بے ایمانیوں کا بدلہ لے لیا تھا۔

"پتھر کی شہزادی"

"اے شفو کی بچی استری ہو بھی گئی..... کریز ٹھیک سے بٹھا دی ہے نا..... اور وہ سویٹر۔"

فرش پر بیٹھے نوجوان عاصم نے بہن کی طرف دیکھا۔ وہ جوتوں کو برش سے رگڑ رگڑ کر چمکا رہا تھا۔ اس کے ہاتھ تیزی سے کام میں مصروف تھے۔ اور وہ برآمدے کے ننگے فرش پر اکڑوں بیٹھا تھا..... اس کے قریب ہی فرش پر کپڑا ڈالے شفو اس کے کپڑے استری کر رہی تھی۔ اس نے براؤن پینٹ استری کر کے دیوار کے ساتھ لگی چارپائی پر ڈال دی تھی۔

"یہ سویٹر بھی استری کرنی ہے....." اس نے منہ بناتے ہوئے انگلیوں کے پپوٹوں سے پکڑ کر پوچھا۔

"بو آ رہی ہے اس میں سے لنڈے کی..... ہائے ہائے....."

"بکو نہیں....." اس نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے غصے کا اظہار کرنے کی کوشش کی۔ حالانکہ شفو نے جس طرح منہ بنایا اور ناک چڑھائی تھی۔ اسے دیکھ کر ہنسی آ گئی تھی۔

اسے استری کرنے کی ضرورت کیا ہے بھی صاحب..... پہنو گے تو خود بخود استری ہو جائے گی۔ لنڈے کا مال اور استری..... ہونہہ....." وہ تمسخر سے ہنسی..... بھائی کو چھیڑنا جو مقصود تھا۔

"پھر وہی..... لنڈے کا لیبل لگا ہے کیا اس پر..... دیکھنا تو سہی جب یہ دولت پہنیں گے اسے تو کتنے شاندار لگتے ہیں۔ ایک دم نوابزادے..... ایک دم....."

"بس بس..... اپنے منہ میاں مٹھو بننا چھوڑ دیجیے صاحب عالی"

www.freepdfpost.blogspot.com

"تو کیا ہم شاندار نہیں....."

"ہیں صاحب ہیں..... ہم کیا کریں..... اچھا یہ لیں سویٹر بھی استری کر دی۔ اب کوئی اور کام نہ دے دیجئے گا۔ کنیز کو بھی کالج جانا ہے اور یونیفارم استری کرنا ہے ابھی۔ اور دیر کر دی نا تو بس نکل جائے گی..... اور جناب مجھے کالج چھوڑنے نہیں جا سکیں گے۔ کیونکہ جناب نے دفتر وقت پر پہنچنا ہوتا ہے۔

"اچھا اچھا....." وہ پھر جوتوں کی طرف متوجہ ہو گیا..... اور شفو اپنے کپڑے استری کرنے لگی۔"

"ویسے" وہ قمیض پر استری پھیرتے ہوئے بولی۔

"کیا؟"

"یہ اتنا اہتمام کیوں ہو رہا ہے آج....."

"تجھے بتایا تو تھا....."

"کیا؟"

"آج میڈم آ رہی ہیں۔"

"اوہو..... تبھی....."

"کیا مطلب؟"

"میڈم۔ وہی نا..... ربیعہ مجید..... مجید گروپ آف انڈسٹری کی نئی مالکہ....."

"جی ہاں....." وہ گردن گھما کر بہن کو دیکھتے ہوئے ایک دم ہی سنجیدہ ہو کر بولا "پتہ ہے وہ کس لئے آ رہی ہیں....."

"مجھے کیا پتہ....."

"اپنے نئے آفس کے لئے سٹاف کی ضرورت ہے نا اسے..... جعفر بتا رہا تھا۔ ہمارے دفتر سے بھی کچھ لوگوں کو ادھر منتقل کرے گی..... اور جو بھی منتخب ہوا۔ بس کھٹ جائے گا۔ فائدہ ہی فائدہ....."

"کیسے"

"جعفر نے کہا تھا۔ کہ وہاں تنخواہ بھی زیادہ ہو گی اور سہولتیں بھی۔ کیا پتہ مجھے بھی منتخب کر لے۔ مزہ ہی آ جائے خدا قسم....."

"چلو شکر کرو۔ نوکری مل گئی ہوئی ہے۔ پتہ ہے نا بیکاری کے دن....."

"توبہ توبہ..... خدا کا شکر ہے بھئی..... ٹھیک ٹھاک تنخواہ مل رہی ہے۔ میرے دو تین دوست ابھی تک مارے مارے پھر رہے ہیں....."

"تمہیں تو تیسری دفعہ بھی جلد ہی نوکری مل گئی۔ چند ماہ ہی بیکار بیٹھنا پڑا....."

"پہلے والی دونوں نوکریوں سے یہ نوکری بہت اچھی ہے..... اور..... اور..... بھی اچھی ہو جائے جو میڈم مجھے اپنے نئے دفتر کے لئے چن لیں..... ریکارڈ تو [illegible] ہے ہی..... اس پہ یوں بن ٹھن کے جائیں گے تو..... واہ واہ..... واہ وا" شفو نے ہنستے ہوئے اس کی نقل اتاری "کیا کہنے شہزادہ صاحب کے..... لنڈے کی سویٹر اور....."

"بس چپ رہ....."

"کوئی سینٹ وینٹ ہے پاس تو لگا لیتا۔ دھونے کے باوجود اس میں سے لنڈے کی بو آ رہی ہے بھی صاحب۔ مذاق نہیں کر رہی....."

"سینٹ کہاں سے آیا میرے پاس..... اتنے پیسے بچتے ہی کہاں ہیں۔ تو کھا جاتی ہے سارے کے سارے۔"

"میں؟"

"تو اور....."

"اپنی اماں سے لو حساب کتاب"

"وہ کیا کریں بیچاری۔ کچھ [illegible] چلاتی ہیں۔ کچھ تیرے لئے بچاتی ہیں۔"

"میرے لئے؟"

"تو اور کیا۔ تیری شادی نہیں کرنی کیا۔"

"اے ہو۔ پہلے اپنی فکر کر....."

"اپنا تو معاملہ طے ہے۔ اب تو خالو سجاد کو بھی اعتراض نہیں محترمہ صاحبہ..... مابدولت کمانے لگے ہیں اور خالہ سلمی بیچاری تو پہلے ہی ہم پر جان چھڑکتی ہیں۔

خالہ سلمی یا ان کی صاحبزادی طاہرہ صاحبہ" شفو نے بھائی کو پیار سے تکتے ہوئے

www.freepdfpost.blogspot.com

چھیڑا۔

"مار کھائے گی تو مجھ سے" عمی نے بڑے بھائی کی طرح رعب جھاڑا..... شفو نے استری پر سے ہاتھ اٹھا کر دونوں ہاتھ جوڑ کر کہا "معافی صاحب جی معافی....."

"دونوں کھلکھلا کر ہنس پڑے۔

اور

ان کی ہنسی کی آواز سن کر اماں باورچی خانے سے زور سے پکاریں۔" وہیں ہیچ ہیچ کے جاؤ گے' ناشتہ بھی کرو گے۔ آج دیر نہیں ہو رہی..... ذرا جو ناشتہ تیار نہ ہو۔ تو ادھم مچا دیتے ہو دونوں....."

"دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر ہنس دیئے۔

عاصم نے جلدی جلدی اپنے کپڑے اٹھائے اور سامنے والے کمرے میں گھس گیا۔

شفو بھی جلدی جلدی استری پر ہاتھ چلانے لگی.....

دونوں تھوڑی ہی دیر بعد ماں کے پاس باورچی خانے میں پہنچ چکے تھے۔ عاصم نے کھڑے کھڑے ناشتہ کیا شفو چوکی پر بیٹھ گئی....."

"کیسا لگ رہا ہوں" عاصم نے شفو سے پوچھا تو امی بلائیں لیتے ہوئے بولی "شہزادہ میرا بیٹا شہزادہ "لنڈے کا" شفو نے چھیڑا....."

"دیکھ اماں یہ باز نہیں آتی....." عاصم چائے کی پیالی ہاتھ میں پکڑے پکڑے بولا..... مطلب اس پر لنڈہ لکھا تھوڑا ہے۔ یہ باہر کی سویٹر ہے۔ والائتی..... کوئی باہر سے بھی تو اپنے لئے لا سکتا ہے۔

"ہاں....." امی نے ٹھنڈی گہری سانس بھری پھر دکھ سے بولیں "باہر سے بھی آیا کرتھیں۔ تیرے لئے سویٹر۔"

"بس اماں" شفو جلدی سے بولی "اب ابا بیچارے کو کوسنے نہ دینے لگنا۔" اب تو دنیا میں بھی نہیں رہے۔"

"بڑی آئی ابا کی طرفدار....." اماں چمک کر بولیں۔ کیا ملا تجھے باپ سے۔ تجھے تو اس شکل بھی یاد نہ ہو گی تین سال کی تھی۔ جب وہ گیا تھا باہر....."

"چلو اماں چھوڑو نا..... تین چار برس تو کمائی کھائی ہم لوگوں نے باہر کی....." عاصم بولا۔

"پھر اس کا فرض ختم ہو گیا تھا نا؟"

"بس دماغ گھوم گیا..... چھوڑ دیا بیوی بچوں کو۔ خیر ہمیں کیا لینا..... اچھا برا وقت گزر ہی گیا نا۔ اب تو خوش رہا کر اماں..... تیرا بیٹا کماؤ ہو گیا ہے۔ تیری ساری حسرتیں میں پوری کروں گا۔ بس آج دعا کر میرا کام بن جائے....."

اماں نے دوپٹے کی کنی سے آنکھوں کے گوشے صاف کئے اور عمی کو دعائیں دینے لگیں۔

شفو ہنستے ہوئے بولی "دعاؤں کا کوٹہ ان صاحب پر ہی ختم کر دیتی ہو اماں۔ میرے لئے بھی تو کچھ بچایا کرو۔"

"میری دعائیں دونوں کے لئے ہوتی ہیں۔ خدا تمہیں خوش رکھے....."

"اور آپ کو بھی" شفو مسکراتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"چلیں۔ عمی ایک بار پھر اپنے سراپا پر ناقدانہ نگاہ ڈالتے ہوئے بولا "معتبر لگتا ہوں نا شفو"

"ہیرو لگتے ہو ہیرو..... شکر کرو خدا نے شکل و صورت اچھی دے رکھی ہے۔"

"عاصم نے سینہ تان کر ہاتھ سے بجایا اور بولا "شکل و صورت اچھی ہے۔ خدا نے چاہا تو مالی حالات بھی جلد بلکہ آج ہی اچھے ہو جائیں گے۔

"چلو..... چلو..... شفو کچن سے نکل کر بولی۔" صرف شکل و صورت سے کام نہیں بنتا۔ صلاحیتیں بھی ہونا چاہئیں۔

"وہ تو ہیں....."

"دونوں نے باورچی خانے سے نکلتے ہوئے ماں کو سلام کیا اور اس کی دلی دعائیں سمیٹے ہوئے ڈیوڑھی کی طرف بڑھ گئے جہاں عاصم کا پرانا کھنارہ سا سکوٹر کھڑا تھا۔

عاصم شفو کو بس سٹاپ پر چھوڑ کر دفتر جایا کرتا تھا۔

www.freepdfpost.blogspot.com

بے انتہا خوبصورت صاف ستھرے اور کشادہ ڈائیننگ روم کی بڑی سی ٹیبل پر ناشتہ لگا تھا۔۔۔۔

لمبی میز کے ایک کنارے پر بیگم مجید بیٹھی تھیں۔ سفید گرم لباس پر انہوں نے شمنے کی بہت قیمتی شال اوڑھ رکھی تھی۔۔۔۔ پچپن سالہ بیگم مجید کے چہرے پر بڑا سوگوار سا وقار تھا۔ پچھلے سال سے وہ بالکل ہی بدل گئی تھیں۔ مجید کی اچانک موت نے انہیں ایسا بنا دیا تھا۔

ربیعہ میز پر ان کے دائیں ہاتھ بیٹھی گھونٹ گھونٹ چائے پیتے ہوئے اخبار دیکھ رہی تھی۔ دو تین فائلیں بھی اس کے قریب ہی رکھی تھیں۔۔۔۔ جلدی جلدی اس نے اخبار کی سرخیاں دیکھیں۔ پھر اخبار رکھ دی گھڑی دیکھی اور اٹھتے ہوئے بولی "اوہو۔۔۔۔ دیر ہو گئی۔۔۔۔"

"ربیعہ۔۔۔۔" بیگم مجید نے جلدی سے کہا۔

"جی امی۔۔۔۔"

"ناشتہ تو کر لے بیٹی۔۔۔۔ صرف چائے کی پیالی۔۔۔۔"

"امی سیب کھا لیا تھا۔۔۔۔"

"یہ کیا بات ہوئی۔۔۔۔ کام کو جنجال بنا لیا ہوا ہے۔"

وہ ماں کے گلے میں بانہیں ڈال کر ان کے گال پر پیار کرتے ہوئے بولی۔ جنجال نہیں امی۔۔۔۔ شکر کریں۔ میں تھی جو پپا کا اتنا بڑا کاروبار سنبھال لیا۔ ورنہ۔۔۔۔ آپ جانتی ہیں جو لوگ آپ کے ارد گرد ہیں۔۔۔۔ کیسے ہیں اور وہ کیا کیا کر سکتے تھے۔۔۔۔"

"بیگم مجید نے ایک ٹھنڈی آہ بھری۔۔۔۔ "لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں ہونا چاہئے ربیعہ۔ کہ تم اپنے آپ کو بھول بھال کر کام میں مٹ جاؤ۔۔۔۔"

"بھولی کہاں ہوں امی۔۔۔۔"

"امی نے ایک سرسری سی نگاہ اس پر ڈالی اور بولیں" یہ بھولنا ہی ہوتا ہے۔ ہر وقت کام کام۔۔۔۔ اپنے بارے میں سوچنے کا وقت ہی نہیں تیرے پاس"

وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی اور بولی "میں جانتی ہوں آپ کیا کہنا چاہتی ہیں۔"

"جاننا بھی چاہئے۔"

"اوہ امی۔۔۔۔ عمر پڑی ہے۔ دیکھا جائے گا۔"

"بوڑھی ہو کر شادی کرے گی۔

وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔۔۔۔ پھر کرسی کی پشت پر لٹکتا بیگ اٹھا کر کندھے پر ڈالا۔ اور ائلیں اٹھاتے ہوئے بولی "فکر نہ کریں۔ بوڑھی ہو کر نہیں کروں گی شادی۔۔۔۔"

"شادی کا بھی ایک وقت ہوتا ہے۔ طلبگار ہوتے ہیں۔ پھر۔۔۔۔"

"اوہ امی" وہ سنجیدہ ہو کر بولی "معاف کیجئے اس وقت جو آٹھ دس طلبگار میرے ارد گرد منڈلا رہے ہیں نا وہ میرے نہیں۔ اس بے انتہا دولت کے طلبگار ہیں۔ جو پپا نہ جانے کیا سوچ کر میرے لئے چھوڑ گئے۔ وہ تو چھوڑ گئے تھے۔ سو چھوڑ گئے تھے۔ تو بھی تو اسے دن رات دگنا چگنا کرنے میں جٹی ہے۔"

"امی۔۔۔۔ اب آپ کو کیسے سمجھاؤں۔ چلتا کاروبار دریا کی طرح ہوتا ہے۔ پیسے کو منجمد نہیں کرنا چاہئے۔ فیکٹری پہ فیکٹری لگائے جانا چاہئے؟

وہ ہنس پڑی "بالکل۔۔۔۔ اس سے اپنا بھی بھلا اور بہت سے غریب اور بیکار لوگوں کا بھی بھلا۔ اور امی ملکی معیشت پر بھی تو اس کا مثبت اثر پڑتا ہے۔

"بس بس۔ لیکچر نہیں سننا میں نے۔"

"تو میں جاؤں۔۔۔۔ آج میں نے عامر صاحب والے دفتر جانا ہے۔ نئے دفتر کے لئے سٹاف چاہئے کچھ لوگ وہاں سے لوں گی۔۔۔۔ مجھے باصلاحیت اور تجربہ کار لوگوں کی ضرورت ہے۔

بیگم مجید پیار بھری ناگواری سے بولیں "تجھے تو ناحق باہر پڑھنے بھیجا تھا۔ پپا نے سوچ سمجھ کر ایسا کیا تھا۔ ورنہ بزنس ایڈمنسٹریشن نہ کرواتے۔۔۔۔ مجھ سے۔۔۔۔"

www.freepdfpost.blogspot.com

"بیٹا جو کوئی نہیں تھا....."

"میں بھی بیٹا ہی ہوں۔"

"نہیں..... تو لڑکی ہے۔ اور....."

"اور شادی اشد ضروری ہے۔"

"بالکل....."

وہ پھر ہنس پڑی اور بولی "دیکھیں امی..... میں اب کوئی ٹین ایجر تو ہوں نہیں۔ کہ شادی کے چاؤ میں جس کا ہاتھ آپ کہیں گی پکڑ لوں گی..... اٹھائیس سال کی ہو چکی ہوں۔ اور اپنے لئے جیون ساتھی کا صحیح انتخاب کر سکتی ہوں۔ جب میں نے کوئی ساتھی پسند کر لیا اور اسے اپنے حالات کے مطابق جانچ پرکھ لیا۔ تو آنکھیں بند کر کے کہہ دوں گی۔ کہ امی کر دیں میری شادی....."

اس نے ہنستے ہوئے ماں کے گال پر بوسہ دیا۔

چل ہٹ۔" امی نے پیار سے کہا۔

جا رہی ہوں۔" اس نے کہا اور پھر نوکر کو آواز دی..... اور فائلیں اٹھا کر لے گیا۔

"باہر گاڑی میں رکھ دو۔ بریف کیس بھی۔" اس نے نوکر سے کہہ دیا تھا۔

پھر

وہ امی کے پاس تھوڑی دیر کھڑی ادھر ادھر کی باتیں کرتی رہی۔

اٹھائیس سالہ ربیعہ مجید بڑی خوش شکل اور سمارٹ تھی۔ چہرے سے ذہانت ٹپکتی تھ
اور آنکھیں تو بلا کی خوبصورت ہونے کے ساتھ ساتھ بے حد ذہین و فطین تھیں۔ وہ دو سا
پہلے امریکہ سے اپنی تعلیم مکمل کر کے لوٹی تھی۔ مجید صاحب نے اسے اپنے ساتھ کام پہ لگا
تھا۔ اور سال بھر میں اس کی اتنی تربیت ہو گئی تھی۔ کہ ان کی فوتیدگی کے بعد اس
کروڑوں کا کام از خود سنبھال لیا تھا۔ گو شروع شروع میں کافی مشکلیں پیش آئی تھیں۔
مختلف فیکٹریوں میں اکثر دیانت دار لوگ تھے۔ مینجر اچھے اور باصلاحیت تھے۔ اس لئے
نے ان کے تعاون سے کام بھی سنبھالا تھا۔ اور بہت کچھ سیکھا بھی تھا۔

اب تو وہ بڑی منجھی ہوئی بزنس وومن تھی۔

"سلمیٰ آپا"

"جی"

"اب تو سجاد بھائی کو کوئی اعتراض نہیں ہے نا۔"

"لو..... اعتراض انہیں پہلے بھی کب تھا..... لیکن عظمیٰ وہ بھی تو ٹھیک کہتے تھے نا۔ جب تک عاصم اپنے پاؤں پر کھڑا نہیں ہو جاتا۔ وہ کیسے اپنی بیٹی کا ہاتھ پکڑا دیتے۔ انہوں نے تمہاری خواہش کا احترام ہمیشہ ہی کیا۔ لیکن زبان صرف اس لئے نہیں دی۔ کہ عاصم کی معقول نوکری نہیں تھی۔ ایک جگہ چھوڑی۔ پھر دوسری جگہ سے جواب مل گیا۔

"اب تو ٹھیک ٹھاک نوکری ہے نا....."

"ہاں تم نے بڑی خوشخبری سنائی..... وہ اب دوسرے دفتر میں منتقل ہو گیا ہے اور تنخواہ بھی بڑھ گئی ہے۔

"خالی تنخواہ؟ سلمیٰ آپا بہت سی سہولتیں بھی مل گئی ہیں اور پتہ ہے؟"

"کیا؟"

"چار چھ ماہ بعد اسے گاڑی بھی دفتر سے ملنے والی ہے۔"

"سچ"

"ہاں اس کے کام سے میڈم بہت خوش ہے۔"

"میڈم....."

"ہاں ربیعہ مجید..... مجید گروپ آف انڈسٹریز کی نئی مالکن..... میاں مجید پچھلے سال فوت ہو گئے تھے اب سارا کاروبار وہی چلا رہی ہے۔ عاصم کے کام سے تو بہت خوش ہے۔ چھ

www.freepdfpost.blogspot.com

مہینوں میں ہی تنخواہ اتنی بڑھا دی۔۔۔۔"

"اللہ زندگی دے بیٹے کو۔۔۔ تم کو بھی خدا خوشیاں دکھائے۔۔۔۔"

"میری خوشیاں تو اس دن رنگ دکھائیں گی جس دن آپ طاہرہ کو میری بہو بنانے کا باقاعدہ اعلان کریں گی۔"

"سلمیٰ خوش تھی۔ ہنستے ہوئے بولی "ٹھیک ہے منگنی کر لیتے ہیں۔۔۔ تم بھی خوش ہو جاؤ اور بات بھی پکی ہو جائے۔"

"ٹھیک ہے سجاد بھائی سے مشورہ کر لو۔۔۔"

"کر لیا ہوا ہے۔ اب تو وہ بھی بہت خوش ہیں۔

"اچھا؟"

"ہاں۔۔۔"

"تو پھر۔۔۔ منگنی کر ہی لیں۔۔۔ عاصم کی بھی تسلی ہو جائے گی۔

"اللہ زندگی دے۔ مجھے تو جانتی ہو شروع ہی سے وہ کتنا پیارا ہے۔"

"اور طاہرہ میری جان ہے شروع ہی سے۔" وہ ہنس کر بولی۔ "آج ہی سجاد بھائی سے بات کر کے مجھے بتا دینے "بالکل بالکل۔۔۔"

دونوں بہنیں کچھ دیر یہی باتیں کرتی رہیں۔

طاہرہ ان دونوں بی اے کے آخری سال میں تھی۔ عاصم کے ساتھ اس کا رشتہ تو ایک طرح سے بچپن ہی سے طے تھا۔ دونوں بہنوں کی دلی تمنا بھی تھی۔ اور خواہش بھی۔ عاصم اور طاہرہ بچپن ہی کے دوست تھے۔ جوں ہی شعور کی حدوں کو پہنچے اور آگہی نے احساس بخشا تو دونوں ایک دوسرے کے خوابوں میں اترنے لگے۔ بے تکلفی حجاب کی لپیٹ میں آ گئی۔۔۔ خاص کر طاہرہ تو عاصم کو دیکھتے ہی سرخ ہو جاتی۔ کانوں کی لویں جلنے لگتیں اور آنکھوں میں حیا کے دیپ جھلملانے لگتے۔ عاصم کو اس کی یہ ادا بے حد بھاتی۔ وہ جان بوجھ کر اس کو چھیڑتا۔۔۔ "بچپن میں اتنی باتونی ہوتی تھی۔ اب مجھے دیکھتے ہی زبان پر تالے کیوں پڑ جاتے ہیں۔ میں تمہیں کھا تو نہیں جاؤں گا۔ کترا تی کیوں ہو مجھ سے وہی ممی ہوں۔۔۔ جس سے ہر وقت تکرار کرتی تھیں۔ جھگڑا لو کہیں کی۔ لڑنے کے سوا تجھے کچھ آتا ہی نہیں تھا۔۔۔ اب۔۔۔"

"اب

وہ ویسی نہیں رہی تھی۔۔۔ شرمانا لجانا فطری تقاضہ تھا یہ اس کے حسن میں اک بیش بہا اضافہ تھا۔ دونوں اب بھی ملتے تھے۔ چونکہ خالہ زاد تھے اس لئے نہ ہی طاہرہ کو ان کے ہاں جانے سے کوئی روکتا تھا نہ ہی عاصم پر خالہ کے ہاں آنے پر کوئی پابندی تھی۔ دونوں سب کے سامنے بھی ملا کرتے تھے اور تنہائی میں بھی۔۔۔"

لیکن

ان کی ملاقاتیں اب تک معصوم اور بے ضرر ہوا کرتی تھیں۔ حد سے بڑھنے کا کبھی دونوں کو خیال ہی نہیں آیا تھا۔ ہاں دل کی باتیں اب اشاروں کنایوں میں آپوں آپ ہو جاتی تھیں۔

عاصم جب کچھ دن طاہرہ کے ہاں کا چکر نہیں لگاتا تو سراپا انتظار طاہرہ جب وہ آتا۔ تو ایسی شاکی نظروں سے اسے دیکھتی کہ عاصم کو اپنی غلطی کا احساس ہو جاتا۔ وہ شرمساری سے اسے دیکھتا اور پھر معافی کی طلب گار بھی اس کی نگاہیں ہی ہوتیں۔۔۔ جنہیں طاہرہ کے شبنمی ہونٹوں پر پھیلی ہلکی سی مسکان احساس دلا دیتی کہ چلو جی معاف کیا۔

دونوں کے پیار سے گھر والے آگاہ تھے۔ شفو تو درمیانی کڑی کی حیثیت اختیار کر گئی تھی۔ نامہ و پیغام کی ضرورت پڑتی تو وہی یہ فرض انجام دیا کرتی۔۔۔ وہ طاہرہ کی بہترین دوست بھی تو تھی۔

والدین بھی دونوں کو ایک رشتہ میں منسلک کرنے کے خواہشمند تھے۔ صرف سجاد راہ میں حائل تھے۔ وہ بھی صرف اس حد تک جب تک کہ عاصم اپنے پاؤں پر مضبوطی سے کھڑا نہیں ہو جاتا۔ تب تک زبان سے اس رشتے کے بندھن کا اقرار نہیں کیا جا سکتا۔

اب وہ برسر روزگار تھا۔۔۔ دن بدن ترقی کی منزل کی جانب قدم اٹھ رہے تھے۔ ربیعہ نے جب سے اسے اپنے نئے سٹاف میں شامل کیا تھا۔ تقدیر کچھ ضرورت سے زیادہ ہی مہربان ہو گئی تھی۔ تنخواہ بھی بڑھ گئی تھی۔ الاؤنس بڑھ گئے تھے۔ اور دیگر سہولتیں بھی زیادہ ہو گئی تھیں۔ اب وہ اس قابل ہو گیا تھا۔ کہ گھر کے افراد کے بوجھ کے ساتھ بیوی کا بار بھی اٹھا سکے۔

www.freepdfpost.blogspot.com

"عاصم صاحب" چپڑاسی نے عمی کی ٹیبل کے سامنے رکھے ہوئے کہا۔

"ہوں" عمی فائل پر جھکا ہوا کام میں مصروف تھا۔

"میڈم نے بلایا ہے آپ کو" وہ بولا۔

"مجھے"

"جی ہاں"

"ابھی"

"آدھ گھنٹے بعد..... جو کام انہوں نے دیا ہے مکمل کر کے فائل ساتھ لے جایئے گا۔

"اوہ اچھا....." عمی نے وال کلاک پر نگاہ ڈالی۔ پھر اپنی کلائی پر بندھی گھڑی دیکھی۔ ابھی پچیس منٹ باقی تھے۔ وہ پھر فائل پر جھک گیا اور اس کا ہاتھ تیزی سے قلم چلانے لگا۔

وہ جب سے اس دفتر میں منتقل ہوا تھا۔ اس کی صلاحیتیں اجاگر ہونے لگی تھیں۔ وہ اور بھی زیادہ محنت اور لگن سے کام کرنے لگا تھا۔ میڈم کی نظروں میں آنے کے لئے تگ و دو کی ضرورت تھی اور وہ اس طور ہو سکتی تھی۔ کہ ہر کام کو دیانت داری سے کرے۔ میڈم کی نظروں میں آجانے سے اس کی ترقی کے امکانات اور بڑھ سکتے تھے۔

اور

جب سے اس نے سنا تھا۔ کہ میڈم دفتر کے نئے سٹاف میں سے کسی ایک کو ٹریننگ کے لئے باہر بھیجنا چاہتی ہیں..... تب سے وہ کام میں یوں جت گیا تھا۔ کہ اپنے کام کے علاوہ میڈم کے اور چھوٹے موٹے کام بھی نپٹانے لگا تھا۔ اکثر چھٹی کے بعد بھی اپنی سیٹ پر بیٹھا کام کرتا رہتا۔ پچھلے ہی ہفتے جب میڈم اپنے آفس سے باہر آئی تھیں..... تو سارا ہال خالی ہو چکا

تھا۔ صرف عاصم اپنی سیٹ پر بیٹھا تھا..... اور کام میں اس طرح مصروف تھا۔ کہ اسے ربیعہ مجید کے قریب آنے کا احساس تک نہ ہوا تھا۔

"عاصم صاحب۔" اس نے حیرانگی سے اسے دیکھ کر پکارا تھا۔

"جی..... جی میڈم" وہ اسے اپنی ٹیبل کے پاس کھڑے دیکھ کر کچھ گھبرا سا گیا تھا۔

"کیا بات ہے۔ چھٹی ہو چکی سارا سٹاف جا چکا..... آپ ابھی تک بیٹھے کام کر رہے ہیں۔"

"وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور مودبانہ انداز میں بولا۔ "جعفر کا تھوڑا سا کام رہ گیا تھا۔ میں نے سوچا اسے آج ہی ختم کر دوں....."

"اور آپکا اپنا کام....."

"وہ تو میں نے وقت پر ختم کر لیا تھا..... فائل مینجر صاحب کو پہنچا دی تھی۔"

"ہاں میں نے دیکھ لی تھی..... میں آپ کے کام سے بہت خوش ہوں۔"

"شکریہ میڈم....."

"مجھے آپ ایسے باصلاحیت آدمیوں ہی کی ضرورت تھی۔ مجھے خوشی ہے کہ میں آپ کو اپنے آفس میں لے آئی۔ میں آپ کا شکر گزار ہوں....."

"شکر گزار تو مجھے آپ کا ہونا ہے۔" وہ قدرے مسکرائی اور عاصم پر ایک خوبصورت نگاہ ڈالتے ہوئے بولی۔ "آپ اتنی محنت کس کے لئے کرتے ہیں....."

"وہ ایک دم ہی کہہ گیا۔ "آپ کے لئے میڈم....."

"ربیعہ سر ہلاتے ہوئے مسکرا دی..... عاصم کچھ گڑبڑا سا گیا..... میڈم چلی گئی اور وہ اپنے آپ سے الجھتا رہ گیا۔ کہ اسے یوں نہیں کہنا چاہئے تھا..... کہنا تو یہ چاہئے تھا..... کہ محنت اپنے لئے کرتا ہوں۔ اپنی روزی آپ کے لئے کرتا ہوں اپنے مستقبل کو شاندار بنانے کے لئے کرتا ہوں۔

لیکن

اس کے منہ سے ایکدم ہی یہ جملہ نکل گیا تھا۔ کہیں میڈم بیگانہ نہ مان لیا ہو۔

لیکن

www.freepdfpost.blogspot.com

اس خیال کی نفی اس مسکراہٹ سے ہو جاتی تھی۔ جو ربیعہ کے ہونٹوں پر لہرائی تھی ..... دو تین دن وہ اپنے آپ سے اسی بات پر الجھتا رہا تھا.....

لیکن تیسرے دن ربیعہ نے اسے آفس میں بلایا تھا اور فائل چیک کرنے کے بعد نئی فیکٹری کے متعلق اس سے صلاح و مشورہ کرتی رہی تھی تو وہ پر سکون ہو گیا تھا۔ وہ اس بات سے اب خوش تھا۔ کہ ربیعہ اس کے کام سے انتہائی مطمئن اور خوش ہے.....

اب ہر روز وہ اسے اپنے آفس میں بلا کر نئی فیکٹری کے متعلق کچھ نہ کچھ بتاتی رہتی..... کئی باتوں پر اس کا نقطہ نظر معلوم کرتی..... اس کی رائے مانگتی.....

آج بھی اس نے اسے بلا بھیجا تھا۔

عاصم نے سارا کام تسلی سے نپٹایا اور فائل اٹھاتے ہوئے آفس کی طرف بڑھ گیا۔ ہال میں مختلف سیٹوں پر بیٹھے لوگ اب اس کے اس طرح آفس میں جانے پر آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارے کنایے بھی کرنے لگے تھے۔

کوئی اسے چاپلوس کہتا..... کوئی چالاک اور ہوشیار قرار دیتا۔ کچھ نے تو یہاں تک کہہ دیا۔ "وجیہ و شکیل آدمی ہے..... میڈم کو چکر دے رہا ہے اپنے فائدے کے لئے....."

جتنے منہ اتنی باتیں۔

عاصم کو صرف اور صرف اپنے کام اور اپنے روشن مستقبل کی فکر رہتی تھی۔ اسنے ان اشاروں کنایوں کو کبھی دیکھا ہی نہیں تھا۔

وہ آفس میں آیا۔ بڑی سی شاندار ٹیبل کے پیچھے گدے دار گھومنے والی کرسی پر ربیعہ بیٹھی تھی۔ میز پر رکھے دونوں فون اس نے کانوں سے لگا رکھے تھے۔ ایک پر کسی کا پیغام سن رہی تھی۔ دوسرے پر کسی کو کچھ ہدایات دے رہی تھی۔

عاصم ٹیبل کے دوسری طرف کھڑا تھا..... وہ ربیعہ کی شخصیت سے مرعوب تھا۔ وہ کسی لائق فائق مرد سے کسی طور کم نہ تھی۔ جس طرح سارے بزنس کو ہاتھ میں لے رکھا تھا۔ اور چلا رہی تھی۔ اسکی ذہنی صلاحیتوں اور قابلیت کا اعتراف نہ کرنا زیادتی تھی۔

فون رکھ کر اس نے عاصم کی طرف دیکھا۔

"بیٹھئے۔" وہ کرسی میں آگے کو جھکتے ہوئے بولی۔

عاصم نے فائل اس کے سامنے رکھ دی۔ اور مودبانہ بولا۔ "آپ نے بلایا تھا۔"

"ہاں" وہ بولی۔ "نئی فیکٹری کی جوا - یکسٹشن ہو رہی ہے وہ دیکھنے جانا تھا۔

"مجھے؟"

"میرے ساتھ آپ کو بھی..... میں اس کے بارے میں آپ سے مشورہ لینا چاہتی ہوں..... سائٹ پر چلنا ہے۔"

"ابھی....."

"جی ہاں..... کوئی اعتراض ہے۔ وہ بے تکلفی سے مسکرائی تو عاصم سر جھکائے جھکائے قدرے گھبرا کر بولا۔ "جی مجھے کوئی اعتراض کیوں ہو گا۔ آپ کا حکم ماننا میرا فرض ہے۔"

"میں چاہ رہی تھی..... کہ چند دنوں کے لئے آپ آفس کی بجائے سائٹ پر چلے جایا کریں۔"

"اور آفس کا کام....." وہ جلدی سے بولا.....

"سائٹ سے آنے کے بعد کر لیا کریں۔ ویسے بھی آپ کو اوور ٹائم لگانے کی عادت ہے۔"

عاصم نے سر اٹھا کر اک نگاہ اس پر ڈالی۔ وہ بڑے لطیف انداز میں مسکرا رہی تھی..... عاصم کے اندر کچھ شور سا مچ گیا گھنٹیاں سی بج اٹھیں.....

لیکن

وہ جان نہیں پایا۔ کہ یہ گھنٹیاں کس نوعیت کی تھیں۔ خوشی کی علامت تھیں۔ یا خطرے کا الارم وہ اس دن ربیعہ کے ساتھ دو گھنٹے سائٹ پر گھومتا پھرتا رہا..... باتیں بھی ہوتی رہیں..... ضروری بھی اور غیر ضروری بھی۔ دونوں میں کافی بے تکلفی سے بھی گفتگو ہوئی۔

لیکن

عاصم نے بے تکلفی میں بھی احترام کو ملحوظ رکھا۔

www.freepdfpost.blogspot.com

نئی گاڑی کی خوشی میں وہ شام سب کو سیر کرانے لے جاتا۔ کبھی اماں اور شفو کے ساتھ خالہ اور طاہرہ بھی ہوتیں۔ کبھی دوست ہوتے اور کبھی طاہرہ کے چھوٹے بھائی۔ سب کی خوشیوں کا ٹھکانہ نہیں تھا۔

عاصم پر نئی نئی مراعات کے در کھل رہے تھے۔ گاڑی کے ساتھ پٹرول بھی فری تھا۔ ٹیلیفون بھی فیکٹری کی طرف سے ملا تھا..... جسے ربیعہ نے اپنا اثر و رسوخ استعمال کرتے ہوئے بہت جلد گھر میں لگوا دیا تھا۔

ٹیلیفون اور گاڑی کی سہولت مل گئی تھی۔ لیکن وہ رہ ابھی اپنے ساڑھے چار مرلے کے گھر ہی میں رہا تھا۔ شفو نے ایک دن کہا۔ "صمی..... تمہیں اتنا زیادہ ہاؤس رینٹ ملتا ہے۔"

"تو....." وہ بولا۔

"کیا ہو جو کسی اچھے علاقے میں کرایہ پہ کوٹھی لے لو....."

"ہوں..... اڑنے لگیں ہوا میں ن....."

"کیوں نہ اڑوں..... پر ہوں تو اڑانیں بھری جاتی ہیں نا..... دیکھو نا..... گاڑی کھڑی کرنے کا کتنا مسئلہ ہے وہ گلی سے دور کھڑی کرتے ہو..... جو کبھی محلے کے بچوں نے دھاوہ بول دیا تو....."

"لینے کے دینے پڑ جائیں گے..... کہتی تم ٹھیک ہو..... گاڑی ہے بھی کمپنی کی....."

"استعمال تو تم ہی کرتے ہو نا....."

"اچھا سوچیں گے جناب۔"

"یہ گھر ہم کرایے پر اٹھا دیں گے۔"

"بیچ ہی کیوں نہ دیں....."

"یہ بھی ٹھیک ہے عفت آپا تو پیچھے پڑی ہوئی ہی ہیں..... خرید لیں گی....."

"اماں سے کہو نا..... تو جان کو آئیں گی۔"

"اے نہیں..... اب اماں بھی کچھ کچھ ماڈرن ہوتی جا رہی ہیں....." شفو کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ عاصم بھی ہنس دیا.....

دونوں سر جوڑ کر صلاح و مشورہ کرنے لگے..... شفو کے دلائل کافی مضبوط تھے۔ اس لئے صمی بھی اس کا ہم خیال ہو گیا..... خصوصاً" جب شفو نے یہ کہا کہ دیکھو نا صمی طاہرہ کا گھر کتنا اچھا ہے..... دس مرلے کا صحن ہے تو بنگلہ..... وہ اب بنگلہ چھوڑ کر اس محلے کے گھر میں آ کر رہے گی تو اسے ایڈجسٹ ہونے میں کوفت نہیں ہو گی کیا....."

طاہرہ کے لئے صمی کیا کچھ کرنا چاہتا تھا۔ کتنی رنگین و حسین خواہشیں اس نے پال رکھی تھیں۔ کتنے سنہری خواب بن رکھے تھے۔ یہ وہی جانتا تھا۔ شفو نے اس کی کمزوری بھانپ کر ہی طاہرہ کے حوالے سے بات کی تھی۔ وہ جھٹ راضی ہو گیا تھا۔

"تو اسی مہینے کرایے پر گھر لے لیتے ہیں۔ کسی اچھی سی صاف ستھری کالونی میں..... پھر یہ گھر جب بکا تو زمین خرید لیں گے اور خوبصورت سا چھوٹا سا پیارا سا بنگلہ بنوا لیں گے۔"

"فیصلہ" شفو نے ہاتھ بڑھایا۔

"فیصلہ" صمی نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ مارا.....

پھر دونوں کھلکھلا کر ہنس دیئے..... اور ان کی ہنسی ہی کی آواز سن کر اماں صحن سے اٹھ کر اندر آ گئیں۔

"کیا ہلا..... جو یوں ہنس رہے ہو۔" اماں خوش گوار لہجے میں بولیں۔

"بہت کچھ اماں....." شفو بولی۔ "بھائی کی تنخواہ بڑھ گئی ہے۔"

"چل ہٹ۔" صمی بہن کے سر پر چپت لگاتے ہوئے بولا۔ "اب اتنی بھی نہ بڑھی..... کہ ہر مہینے تنخواہ میں اضافہ ہونے لگے....."

"وہ مہربان تو میڈم مہربان۔" شفو نے انگلی آسمان کی طرف اٹھائی اور میڈم آتے

www.freepdfpost.blogspot.com

مضحکہ خیز لہجے میں کہا کہ ممی اور اماں ہنسنے لگے۔

پھر اماں سنجیدہ ہوتے ہوئے بولیں۔ "واقعی جو وہ مہربان تو سب مہربان۔ اللہ کی کرم نوازی ہے۔ یہ سب..... خدا زندگی دے اور نصیب یاور ہوں۔"

"وہ تو ہیں ہی۔" شفو بھائی کی طرف دیکھ کر مسکرائی۔ "مہینوں میں امیر ہوتے جا رہے ہیں۔ گاڑی' ٹیلیفون' بنگلہ....."

"بنگلہ بھی ملا ہے؟" اماں نے اشتیاق سے پوچھا تو شفو جھٹ سے بولی۔ "اماں بنگلے کا کرایہ تو ممی کو ملتا ہے میڈم نے کہا ہے یا تو بنگلے میں رہو نہیں تو کرایہ نہیں ملے گا..... اور اتنے ہزار روپے کی کٹوتی کروانی ہے..... یا....."

ممی زیر لب مسکراتا رہا اور شفو اماں کو گھما پھرا کر بنگلے میں اٹھ جانے پر آمادہ کرنے لگی۔

جمال کروڑ پتی باپ کا اکلوتا بیٹا تھا۔ اکلوتا ہونے کی وجہ سے [illegible] نے کی عادت تھی۔ بگڑے ہوئے امیر زادوں کی ہر عادت اس میں تھی..... پیسے کی کمی نہ تھی..... نئی نئی گاڑیاں خریدنے کا شوق تھا۔ آئے دن یورپ امریکہ اور فار ایسٹ کے چکر لگتے..... اونچی سوسائٹی میں روح رواں کی حیثیت تھی۔ پینے پلانے اور نئی نئی حسیناؤں کے چکر میں اکثر سدھ بدھ بھی کھو دیتا..... چونکہ ماں باپ کی واحد اولاد تھی اور من مانی کرنے کی ضد کی حد تک بگڑی ہوئی عادت..... اس لئے جو بات منہ سے نکال دیتا اسے پورا کرنا ضروری سمجھتا.....

ربیعہ میں وہ دلچسپی رکھتا تھا..... ماں سے صاف صاف کہہ دیا تھا۔ کہ وہ اس سے شادی کرے گا..... خود ربیعہ سے بھی اسنے شادی کی بات کی تھی۔

لیکن

ربیعہ نے شادی ابھی کرنا ہی نہیں تھی اور اس کا جو نقطہ نظر تھا اس نے اپنی ماں پر واضح بھی کر دیا تھا۔ اس کی پرکھ کی کسوٹی پر تو جمال پورا ہی نہ اترتا تھا.....

اس کسوٹی پر تو ناصر بھی نہیں پورا اترتا تھا۔ جو صاحب حیثیت بھی تھا اور تعلیم یافتہ بھی۔ لیکن اس کی حرص و ہوس پیسے کے معاملے میں بڑھتی جا رہی تھی۔

اسلم' فرید' اکبر اور راحت خان بھی ربیعہ کے اردگرد منڈلاتے تھے۔ بیرونی یونیورسٹیوں سے بڑی بڑی ڈگریاں لے کر بھی آئے تھے اور مالدار والدین کی اولادیں بھی تھے۔ لیکن سب اونچی سوسائٹی کے مخصوص افراد تھے..... شراب و شباب سے دلچسپی ان کا حق تھا..... رنگین محفلیں سجاتے تھے اور خوب پیسہ لٹاتے تھے۔ ان میں سے بیشتر نوجوان ایسے تھے۔ جو ربیعہ کے سنہری پس منظر پر آنکھیں لگائے تھے۔ کروڑوں کی واحد مالک ربیعہ اس

www.freepdfpost.blogspot.com

دولت ہی کی وجہ سے انہیں عزیز تھی.....

راحت خان اور اسلم نے تو باقاعدہ رشتہ بھی بھیجا تھا۔

اور

اب جمال کی ممی اپنے اکلوتے بیٹے کے کہنے پر ربیعہ کی امی کے پاس اس کا ہاتھ طلب کرنے آئی تھیں۔ دولت کے مظاہرے کے لئے بے شمار انتہائی قیمتی تحائف بھی ساتھ لے کر آئی تھیں۔

"جمال ہمارا ایک ہی ایک بیٹا ہے..... جو کچھ ہمارے پاس ہے سب کچھ اس کا ہے۔ تین نیکسٹائل ملیں ہیں..... ہر بڑے شہر میں ہماری ذاتی کوٹھی ہے..... اس کے پپانے حال ہی میں لندن میں بھی ایک ولا خریدا ہے..... باہر بھی ہمارا اتنا پیسہ ہے کہ کوئی کام نہ بھی کریں تو پشتیں گھر بیٹھ کر آسانی سے کھا سکتی ہیں....." وہ اپنے اثاثوں کے متعلق تفصیل سے ربیعہ کی امی کو بتاتی رہی۔

اور

سب کچھ سننے کے بعد ربیعہ کی امی نے صرف یہی کہا۔ "اللہ کا دیا ہمارے پاس بھی بہت ہے۔ شادی کا معاملہ ہے عمر بھر کا بندھن ہوتا ہے۔ میں ربیعہ کی مرضی کے بغیر کچھ نہیں کر سکتی....."

"آپ ماں ہیں..... آخر اس کی شادی تو آپ ہی نے کرنی ہے۔"

"ٹھیک ہے..... میں اس سے بات کروں گی....."

"صرف بات ہی نہیں فیصلہ بھی کرنا ہو گا۔"

"میں اسے مجبور نہیں کر سکتی۔ وہ اپنی اچھائی برائی خود سمجھتی ہے۔"

جمال کی ممی ایک بار نہیں کئی بار اس غرض سے ربیعہ کی امی کے پاس گئی.....

لیکن

اسے ہر بار یہی جواب ملا کہ ربیعہ جہاں چاہے گی اس کی شادی وہیں ہو گی..... وہ فی الحال شادی کرنے کے موڈ میں نہیں.....

جمال کسی طور ہار تسلیم کرنے والا نہیں تھا..... اس نے جواب نفی میں ملنے پر بھی اس

نہیں توڑی۔

اور

جب ربیعہ کی امی کے پاس وہ خود بھی اپنی درخواست لے کر کئی بار آیا۔ تو ربیعہ کی امی نے بیٹی سے دوٹوک بات کرنے کا وعدہ کر لیا.....

اور

اس رات جب ربیعہ سونے سے پہلے حسب عادت امی کو شب بخیر کہنے ان کے بیڈ روم میں آئی۔ تو انہوں نے اس کا ہاتھ تھام کر اسے اپنے قریب بٹھا لیا۔ کچھ دیر ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد انہوں نے جمال کے متعلق اسے بتایا.....

"گھرانا اچھا ہے لوگ اچھے ہیں۔ جمال....."

لیکن ربیعہ نے ان کی بات درمیان میں ہی کاٹ دی۔ اٹھتے ہوئے بولی۔ "امی جمال کے متعلق میں جو کچھ سن چکی ہوں اس کا عشر عشیر بھی آپ کے گوش گزار کروں۔ تو آپ ششدر رہ جائیں گی..... شرافت بھی کسی شے کا نام ہے۔ کہ نہیں..... امی میں کسی ایسے دولتمند کا ہاتھ نہیں تھاموں گی جس کے کردار میں شرافت کا خانہ خالی ہو....."

امی بیڈ میں اٹھتے ہوئے بولیں۔ "ایسا کون ہو گا جو ہمہ صفت موصوف ہو....."

"ہمہ صفت و موصوف نہ بھی ہو..... ایسا تو ہو سکتا ہے نا جس کے پاس کردار و اخلاق کی دولت ہو بے شک دولتمند نہ ہو....."

امی نے چند لمحے ربیعہ کی طرف دیکھا اور بولیں۔ "بیٹی..... تم دولتمند ہو۔ یہ ایک سچائی ہے۔ رشتہ ناطہ ہم پلہ ہی کے ساتھ ہونا چاہئے۔ ہزاروں جوان ہوں گے جن کے پاس دولت نہیں۔ لیکن خوبیوں کے مالک ہوں گے لیکن ایسے نوجوان دولتمند بیوی کے ساتھ نبھا نہیں کر سکتے۔"

"کیوں"

"ہمارے معاشرے میں مرد کی بالادستی تسلیم کی جاتی ہے۔ وہ اپنی بالادستی تسلیم کروانے کا عادی ہے۔ لیکن دولتمند بیوی پر بالادستی....." وہ لاشعوری طور پر احساس کمتری کا شکار ہو جاتا ہے۔ پھر وہ اپنی بالادستی تسلیم کروائے گا تو جبر کا سہارا لے گا..... یا....."

www.freepdfpost.blogspot.com

ربیعہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔۔۔

"ایسے تجربے ناکام ہو چکے ہیں بیٹی۔۔۔ مرد احساس کمتری کا شکار ہو کر وحشی بن جاتا ہے۔۔۔"

وہ پھر ہنس پڑی۔۔۔

پھر

امی کو بستر میں لٹاتے ہوئے بولی۔ "اس موضوع پر پھر کبھی بات کریں گے امی۔۔۔ بہرحال آپ جمال صاحب سے کہہ دیجئے۔ وہ کسی اور گھر کا رخ کریں۔ یہاں سے انہیں کورے جواب کے سوا کچھ نہیں ملے گا۔"

"ربیعہ۔۔۔"

"اب آپ آرام سے سو جائیں۔" وہ مسکرائی۔ اور جھک کر ماں کی پیشانی پر بوسے دے کر بولی۔ "شب بخیر"

"شب بخیر۔" امی نے کہا۔۔۔

ربیعہ مڑی اور کمرے سے نکل گئی

"اے جھگڑالو لڑکی۔" عاصم نے مسکرا کر طاہرہ کی طرف دیکھا۔ جو اس کے لئے ناشتہ لے رہی تھی۔ چہرے پر بڑی سنجیدگی چھائی تھی۔۔۔ وہ صبح سے کچھ ناراض ناراض تھی۔۔۔ کتنی دیر سے وہ آیا بیٹھا تھا۔۔۔ باتیں کر رہا تھا۔۔۔ لیکن وہ کسی بات کا جواب دیئے بغیر ناشتہ لے جا رہی تھی۔

"ناراض کیوں ہو۔۔۔" صبح آہستگی سے بولا۔۔۔ "کچھ بتاؤ تو سہی۔۔۔"

طاہرہ نے نگاہیں اٹھا کر ایک لمحہ کو اسے دیکھا۔ اس کی خوبصورت آنکھیں جھلملا رہی تھیں صبح کو یوں لگا جیسے پانی تلے دیپ جل رہے ہوں۔۔۔"

"اوہو۔۔۔" وہ بے اختیار سا ہو گیا جلدی سے اٹھ کر آیا اور اس کی پشت پر کھڑے ہو کر قدرے جھکتے ہوئے بولا۔۔۔ "مجھ سے کیا قصور سرزد ہوا ہے۔۔۔ دو تین دن تمہاری طرف آ نہیں سکا اس نے ناراض ہو۔۔۔"

"اب یہاں آنے کی آپ کو فرصت کہاں۔" وہ ایک دم ہی کہہ اٹھی۔

"اچھا یہ بات ہے۔" وہ گھوم کر اس کے سامنے آ گیا اور ہنستے ہوئے بولا۔۔۔ "تمہیں میرا انتظار کرنا پڑا۔۔۔"

"میں کیوں انتظار کروں۔" وہ غصے سے بولی۔

صبح ہنس پڑا۔۔۔ طاہرہ نے نم آلود آنکھوں سے اسے گھور کر دیکھا۔

صبح گھٹنے کے بل جھک کر اس کے قریب بیٹھتے ہوئے بولا۔ "طاہرہ۔۔۔ تمہیں میری مصروفیات کا علم نہیں۔۔۔ ان دنوں میڈم نے مجھے اپنی نئی فیکٹری پر بھیج دیا ہے۔ وہاں۔۔۔"

www.freepdfpost.blogspot.com

"میڈم کے کاموں کے سوا آپ کو کچھ اور یاد تھوڑا ہی رہتا ہے۔" وہ غصے سے بولی۔

صمی پھر ہنس پڑا۔ اور بولا۔ "پگلی میرے شاندار مستقبل کا انحصار میڈم کی خوشنودی پر ہے۔ میں بڑھ چڑھ کر اس لئے تو اس کے مفاد کے کاموں میں حصہ لے رہا ہوں۔ پتہ ہے۔ عنقریب وہ مجھے ٹریننگ کے لئے باہر بھجوا رہی ہے....."

"مجھے شفو نے بتایا تھا۔"

"پھر....."

"وہ..... وہ....."

"کہو..... کیا کہنا چاہ رہی ہو....."

طاہرہ چند لمحے چپ رہی..... پھر صمی کی طرف شاکی نظروں سے دیکھ کر بولی....." وہ..... وہ آپ میں اتنی دلچسپی کیوں لے رہی ہے....."

"اوہ مارے گئے....." صمی اپنے ہاتھ پر ہاتھ مارتے ہوئے کھلکھلا کر ہنس پڑا۔

پھر وہ ہنستا ہی گیا۔

طاہرہ منہ بسور رہی تھی..... بار بار دوپٹے کے پلو سے اپنی آنکھوں کے گوشے صاف کر رہی تھی۔

"اے پگلی۔" صمی اٹھتے ہوئے بولا۔ اس بات پر مجھ سے ناراض ہو..... میری کامیابیوں سے تم خوش نہیں ہو..... بے وقوف لڑکی..... میڈم مجھ میں کیا دلچسپی لے گی۔ دلچسپی تو میں اس میں لے رہا ہوں....."

"کک۔ کیا؟" طاہرہ نے اپنی خوبصورت آنکھیں پھیلا دیں۔

صمی نے مسکراتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔ "دلچسپی سے یہ مطلب نہ لینا۔ کہ میں اس سے محبت کرنے لگا ہوں....."

"تو..... اور ....." وہ ناراض ناراض لہجے میں بولی۔

صمی پھر ہنس پڑا..... روٹھی روٹھی طاہرہ کتنی پیاری لگ رہی تھی۔ بھولی بھالی لڑکی ذہن میں خواہ مخواہ کے خدشے پال پال کر پریشان ہو رہی تھی۔

صمی کچھ سنجیدہ ہو کر بولا۔ "طاہرہ..... ایسی بات میں سوچ بھی نہیں سکتا۔ میں اس کی عزت کرتا ہوں میرے دل میں اس کے لئے بڑا احترام ہے۔ وہ بڑی عظیم ہے۔ اس نے مجھے کہاں سے کہاں پہنچا دیا ہے۔ یہ تم جانتی ہو....."

"وہ..... وہ صرف آپ پر ہی ایسی مہربان کیوں ہے۔" وہ اب بھی ناراض تھی۔

"پگلی..... یہ میری خوش نصیبی ہے اور کچھ میری محنت..... جو میں اس مقام پر پہنچ گیا ہوں۔ ٹریننگ ختم کر کے واپس آؤں گا تو وہ نئی فیکٹری کا انچارج مجھے ہی بنائے گی۔ پتہ ہے کتنی تنخواہ ملے گی.....؟ وہ خوشی سے لپکتے ہوئے بولا پھر جھک کر اس کے کان میں سرگوشی سی کرتے ہوئے بولا۔ اتنے ڈھیر سارے پیسوں کا کیا کرو گی؟ ہوں..... تمہارے ہی لئے تو کر رہا ہوں سب کچھ..... بیگم صاحبہ بنو گی بیگم صاحبہ....."

وہ اسے چھیڑنے لگا..... منانے لگا..... ستانے لگا۔

اور

طاہرہ جب تک ادائے دلفریبی سے مسکرا نہ دی۔ وہ اسے چھیڑتا ستاتا مناتا رہا۔

PdfStuff.blogspot.com

www.freepdfpost.blogspot.com

سائٹ پر وہ اس کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ ربیعہ اس سے بے تکلفی سے باتیں بھی کئے جا رہی تھی..... فیکٹری کے علاوہ اب کبھی کبھی وہ ذاتی نوعیت کی باتیں بھی کیا کرتی تھی۔ اس نے اپنے پپا کے متعلق ہم کو بہت کچھ بتایا تھا۔ وہ ان سے کتنا پیار کرتی تھی اور ان کی جدائی کو کس شدت سے محسوس کیا تھا۔ اس نے کئی بار اسے بتایا تھا..... اپنی سیدھی سادی امی کے متعلق بھی اس نے عاصم کو بتایا تھا۔ اس دن سائٹ پر گھومتے پھرتے وہ پپا کی باتیں کر رہی تھی..... پپا نے یہ زمین اسی فیکٹری کے لئے خریدی تھی..... لیکن عمر نے وفا نہ کی.....

"یہ فیکٹری بناتے ہوئے مجھے ایک تسکین سی مل رہی ہے۔ پپا اسے جس طرح بنانا چاہتے تھے۔ میں بنا رہی ہوں..... اور پپا اسے جس طرح چلانا چاہتے تھے۔ وہ آپ چلائیں گے....."

"میں؟" عاصم نے کہا۔

"ہاں۔ میں نے پہلے بھی آپ سے کہا تھا۔ کہ یہ فیکٹری آپ رن کریں گے۔"

"جی..... میں اپنی تمام تر صلاحیتیں بروئے کار لانے کی کوشش کروں گا۔"

"مجھے قوی امید ہے۔ کہ آپ یہ کام اچھی طرح سنبھال لیں گے..... آپ کے ٹریننگ لے کر آنے تلک یہ فیکٹری چالو ہو چکی ہو گی....."

"جی امید تو ہے....."

وہ اپنے پپا کے عزائم اور ارادوں کی باتیں کرنے لگی اور باتوں ہی باتوں میں پوچھا۔ "آپ کے والد کیا کرتے ہیں....."

عاصم قدرے مضطرب ہوا پھر بولا۔ "وہ فوت ہو گئے ہیں۔"

"کب؟"

"تھوڑی دیر ہی ہوئی ہے۔"

"افسوس ہوا سن کر۔"

وہ قدرے مسکرایا اور بولا..... "افسوس..... میڈم..... افسوس تو شاید مجھے بھی نہیں ہوا تھا....."

وہ حیرانگی سے بولی..... "کیوں..... آپ کے والد....."

"بس والد کے خانے میں ان کا نام ضرور تھا..... باقی....."

"باقی کیا۔"

وہ دلچسپی سے بولی۔ "آپ کی والدہ ہیں....."

"جی ہیں..... ایک چھوٹی بہن ہے۔ ابو عرصہ ہوا دولت کمانے دوبئی گئے تھے۔ وہاں دولت کمائی بھی لیکن ہمارے لئے نہیں..... دو ایک سال تو ہم سے رابطہ رکھا۔ پھر نئی ایرانی بیوی کے چکروں میں پڑ کر ہمیں بھلا دیا۔ سنا ہے وہ وہاں بزنس بھی کرتے رہے بہت پیسہ کمایا..... لیکن ہمارے لئے کچھ نہیں کیا۔ ہمیں امی نے محنت مزدوری کر کے پالا پوسا....."

"ابو کے مرنے پر بھی آپ کو ان کے اثاثوں سے کچھ نہیں ملا....." وہ اس کی داستان سن کر بڑی متاثر نظر آ رہی تھی.....

"ہم نے کلیم ہی نہیں کیا....."

"کرنا چاہئے تھا۔" وہ بولی۔

"کیا ضرورت ہے..... مجھے اپنے زور بازو پر اعتماد ہے۔"

"لیکن باپ کی چھوڑی ہوئی....."

وہ سب ان کی ایرانی بیوی نے سمیٹ لیا ہو گا۔ ہمیں کیا خبر ان کے پاس کیا تھا کیا نہیں..... ہم نے نہ کبھی کسی سے پوچھا نہ اس کے متعلق کبھی سوچا..... جو کچھ ہمارے پاس ہے ہم اسی سے مطمئن ہیں۔"

www.freepdfpost.blogspot.com

"لیکن محق تو ہے آپ کا....."
"ہے تو..... لیکن کچھ کیا بھی تو نہیں جا سکتا....."
دونوں یہی باتیں کرتے گاڑی کی طرف آ گئے۔

ساڑھے چار مہینے کی ٹریننگ لے کر عاصم لندن سے واپس آیا۔ تو سب کے لئے تحائف لے کر آیا شفو کے لئے تو کافی چیزیں تھیں۔ امی کے لئے بھی اور طاہرہ کے لئے بھی۔

وہ اپنا اٹیچی کیس کھولے بیٹھا تھا۔ شفو اسی طرح جھکی ہوئی تھی۔ لگتا تھا اٹیچی کے اندر ہی گھس جائے گی۔

"ذرا ہٹ کے بیٹھو۔ اتنی ندیدی ہو۔ تمہارے لئے تو میں صرف یہ جوتے لایا ہوں۔" اس نے کورٹ شوز شفو کو دکھائے۔

"اور یہ کیا ہے۔" شفو تجسس سے بولی۔

"سینٹ مائیکل کے سویٹر۔ مابدولت اپنے لئے لائے ہیں۔" اس نے دو خوبصورت پل اوور باہر نکالے۔

"آہا کتنے پیارے اور کیسے خوبصورت نرم و ملائم ہیں....." شفو پیار سے بولی۔

"کیوں جی۔ اب تو لنڈے کے سویٹروں کا طعنہ نہ دو گی نا۔" وہ ہنسا۔

"وہ دن گئے۔" وہ سویٹر دیکھتے ہوئے بولی۔ "اب تو لنڈے سے لنڈن لے ہو گئے ممی صاحب۔"

"فرق کوئی خاص نہیں۔" اس نے چھیڑا۔ ایسے ہی تو سویٹر پہنتا رہا ہوں اب تک کیا فرق ہے!"

"فرق یہ ہے کہ وہ اترنیں تھیں اور یہ..... اپنے پیسوں کے نئے خریدے ہوئے۔

www.freepdfpost.blogspot.com

"بات ایک ہی ہے۔" اس نے چھیڑا۔ تو شفو دلائل دے دے کر اسے قائل کرنے لگی۔ وہ بہت خوش تھا اس کے سر پر چپت لگاتے ہوئے ہنس پڑا.....

پھر

اس نے امی کے لئے لائے ہوئے تحائف دکھائے..... سفید خوبصورت سویٹر۔ اونی موہیر کا سوٹ اور خوبصورت چپکی.....

"میرے لئے صرف یہی۔" شفو نے منہ بسورا اور پھر چپکی میں پیر گھساتے ہوئے بولی۔ "یہ تو میں پہنو گی....."

"اوں ہوں..... امی کی ہے یہ..... بغیر ہیل کے....." صمی بولا۔ "چڑیل کہیں کی دیکھ تیرے لئے اور کیا کچھ لایا ہوں....."

"سچی۔" وہ خوشی سے جیسے باوری ہو گئی۔

صمی نے ایک پنک رنگ کا انگوری وول کا سویٹر اسے دیا۔ پھر کچھ کا سمیٹکس دئے۔ سینٹ کی بڑی سی بوتل اسے دکھاتے ہوئے مسکرا کر بولا۔ یہ میں اپنے لئے لا ہوں۔ گو اب لنڈے کے سویٹر کی بدبو تو کم نہیں کرنی..... پر پرفیوم جو کبھی نصیب نہیں ہوا تھا اپنے لئے خرید ہی لیا....." وہ ہنس ہنس کر شفو کی طرف دیکھ رہا تھا۔ جو اکثر اسے لنڈے کی سویٹر پہننے کے بعد کہا کرتی تھی۔ کوئی پرفیوم لگا لو۔ اس میں سے دھونے کے بعد بھی بو آتی ہے۔"

دونوں بہن بھائی چیزیں بھی دیکھتے رہے اور ہنسی مذاق بھی کرتے رہے۔

جب سب چیزیں دکھا کر صمی اٹیچی بند کرنے لگا تو شفو حیرانگی سے بولی

بس....."

"تو اور کیا۔ اتنے پیسے بھی مشکل سے بچائے تھے۔ الاؤنس بہت زیادہ تو نہیں ملا تھا۔"

"ہائے ہائے۔"

"کیوں....."

"طاہرہ کے لئے کچھ نہیں لائے۔

"کس طاہرہ کے لئے۔"

شفو نے آنکھیں پھیلا کر کہا۔ "اچھا جی۔ اب طاہرہ کو بھی نہیں جانتے....."

"اوں ہوں..... اب تو ہم گوری چمڑی اور نیلی آنکھوں سنہری بالوں والی لڑکیوں ہی کو جانتے ہیں۔"

"ایسی باتیں منہ سے مت نکالیں۔"

"کیوں۔"

"طاہرہ کا پتہ نہیں آپ کو..... پریشان ہو جاتی ہے۔"

"پاگل ہے..... پریشان تو وہ ربیعہ مجید کے نام سے بھی ہو جاتی ہے۔"

"ہونے والی بات تو ہے ہی۔"

"وہ کیوں جی۔"

"بھئی..... آپ پر وہ اتنی مہربان جو ہو گئی ہے۔ کہیں اس وجیہہ و شکیل نوجوان پر اس کا دل تو نہیں آ گیا۔

"ہٹ بیوقوف کہیں کی۔" شفو کی چھیڑ پر وہ ایک دم سنجیدہ ہو گیا....." کیسی باتیں تم لوگوں کے ذہن میں در آتی ہیں۔ کہاں وہ کہاں ہم..... پتہ ہے وہ کتنی ہائیلی ایجوکیٹڈ ہے اور کتنے کروڑوں کی مالک....."

"میں تو مذاق کر رہی تھی..... ویسے صمی..... طاہرہ....."

"چھوڑو اس پاگل کو..... ہاں کہو..... کیسی ہے وہ..... ٹھیک ٹھاک رہی نا....."

"تم اس کے لئے کیا لائے کیا ہو....."

"کچھ بھی نہیں....."

"ایویں نہ ماریں..... ضرور کچھ لائے ہوں گے۔ یہ ہو ہی نہیں سکتا جناب صمی صاحب ہم آپ کو اچھی طرح سے جانتے ہیں....."

صمی مسکرانے لگا..... پھر اٹیچی کھول کر اس نے ایک کونے میں کپڑوں کے نیچے رکھی ایک خوبصورت سے مخملی ڈبیہ نکالی اور بہن کی طرف بڑھا دی.....

شفو خوشی سے جیسے اچھل پڑی۔ پھر بڑے شوق سے ڈبیہ کھولی۔ اس میں

www.freepdfpost.blogspot.com

نازک سی سفید انگوٹھی تھی۔ جس میں ننھے ننھے سات ہیرے چمک رہے تھے۔

"اف کتنی خوبصورت ہے....." شفو بولی۔

"خوبصورت تو اس سے کہیں زیادہ تھیں انگوٹھیاں۔ پیسے ہی نہیں تھے۔"

"یہ بھی بہت اچھی ہے۔"

"پسند۔"

"پسند۔"

"شفو نے انگوٹھی اسے واپس دے دی۔ اور بولی۔ "آج آئے گی طاہرہ....."

صمی مسکرانے لگا..... اور شوخی سے بولا۔ "انگوٹھی پاس ہی رکھو آئے گی تو میری طرف سے دے دینا۔"

شفو بھی اس کی بہن تھی اسے اچھی طرح جانتی تھی اس لئے وہ بھی شوخی سے بولی۔ "اب اتنا بھی نہ بنو پتہ نہیں کتنے چاؤ سے لائے ہو..... میں سچ مچ ہی اسے تمہاری جگہ پہنا دوں گی۔ پھر وہ تم سے روٹھی تو مناتے پھرنا....."

صمی بولا۔ روٹھنے کے سوا شاید اسے اور کچھ آتا ہی نہیں.....

"خود ہی دینا اسے..... میں کباب میں ہڈی کیوں بنوں..... شفو مسکراتے ہوئے بولی اور پھر اپنی چیزیں اٹھا کر کمرے سے نکل گئی۔

صمی کے من میں پھلجڑیاں سی پھوٹنے لگیں۔

پارٹی زوروں پر چل رہی تھی۔ بیگم شائستہ فہم نے اپنے پچیسویں شادی کی سالگرہ منائی تھی۔ شہر کے چوٹی کے لوگ اس کے ملنے جلنے والوں میں تھے۔ بزنس مین بھی تھے اور ہائی کلاس آفیشلز بھی۔ شہر کی گویا کریم تھی۔ جو پارٹی میں مدعو تھی۔ خوبصورت اور جدید ترین ملبوسات کی گویا نمائش تھا۔ چمک دمک جیولری کی کھنک اور پرفیومز کی مہک آپس میں گھل مل گئی تھیں..... عورتیں بنی سنوری تھیں..... بالوں کے اسٹائل دیدنی تھے۔ میک اپ سے چہرے نکھارنے کی کوشش کامیاب تھی۔ کچھ عورتوں نے تو نیم عریاں لباس زیب تن کر رکھے تھے..... اور اپنے حسن کو جاندار بنانے کے لئے عریانی کا سہارا لئے ہوئے تھیں مرد بھی رنگا رنگ لباس پہنے ہوئے تھے۔ کوئی سوٹ پہنے تھا۔ کوئی شلوار قمیض اور کسی نے شوخ رنگ کی پھولدار ٹی شرٹ پہنی ہوئی تھی۔ کسی نے تیز رنگ کے سلک کے کرتے کے ساتھ سفید لٹھے کی شلوار پہن رکھی تھی.....

ہال کے ساتھ ہی بار روم تھا۔ جہاں پینے والے پی پی کر نشے میں بہک رہے تھے۔ ان میں سے جو ہال میں آ جاتا..... عورتوں کے ساتھ لک لک کر باتیں کرتا..... ان کے سٹائل کی کھلے لفظوں میں داد دیتا..... ان کے ننگے بازوؤں پر بے تکلفی سے ہاتھ پھیرتے ہوئے نرم و ملائم جسم کی تعریف کرنے لگتا.....

پارٹی میں شرفا بھی شریک تھے۔ عورتیں اور مرد..... ایسے لوگ ہال کے کناروں پر رکھے صوفوں پر بیٹھے تھے..... بڑے سنبھل کر اور بڑے محتاط ہو کر..... کوئی کوک پی رہا تھا اور کسی کے ہاتھ میں پانی کا گلاس تھا.....

www.freepdfpost.blogspot.com

ربیعہ بھی اپنی امی کے ساتھ ایک صوفے پر بیٹھی تھی۔ وہ امی کو ان لوگوں کے بارے میں بتا رہی تھی۔ جو دولت مند تھے اور عیاشی کو اپنا حق سمجھتے تھے۔

ان میں جمال بھی تھا..... اکبر بھی اور فرید بھی..... سب پی پی کر مست ہو رہے تھے..... اور میوزک پر تھرک رہے تھے۔ ان کی بانہوں میں کبھی ایک عورت ہوتی کبھی دوسری..... ڈانس جو ہو رہا تھا..... گو ربیعہ کی امی ایسی پارٹی میں پہلی بار نہیں آئی تھیں..... لیکن انہوں نے جمال کو پہلی بار نشے کی اس حالت میں دیکھا تھا..... وہ بہک بہک جاتا تھا۔ اور جب ڈانس کرنے والوں نے ہیا بھاگڑی مچا دی تو وہ ایسی الٹی سیدھی حرکتیں کرنے لگا۔ کہ ربیعہ تو ربیعہ اس کی امی کو بھی اس سے گھن آنے لگی۔

اس کے بعد ربیعہ کی امی نے جمال کی وکالت نہیں کی۔

اور

ربیعہ کے ذہن سے جیسے بہت بڑا بوجھ اتر گیا۔

دو دن سے وہ دفتر نہیں آ رہی تھی۔ پاؤں میں موچ آ گئی تھی۔ دو دن تو عاصم فون پر ہی اس سے ہدائتیں لیتا رہا۔ لیکن تیسرے دن اسے خود اس کے پاس جانا پڑا۔ کچھ پیمنٹس کرنا تھیں۔ چیک پر ربیعہ کے دستخط ہونا تھے۔

وہ اس کے گھر جانے سے ہچکچا رہا تھا۔ لیکن جب ربیعہ نے خود ہی اسے بلایا تو وہ اس کے ہاں چل دیا وہ ڈرائینگ روم میں آ گئی..... بمشکل ایک پاؤں پر وزن ڈالتے ہوئے وہ صوفے پر آ بیٹھی..... اس نے شال سے اپنے آپ کو لپیٹ رکھا تھا۔ دفتر میں چاک و چوبند رہنے والی میڈم ایک دم عام گھریلو سی لڑکی لگ رہی تھی۔ عاصم اسے دیکھ کر حیران ہوا..... لیکن پاس ادب ملحوظ تھا۔ اس لئے ایک طرف کھڑا رہا..... وہ اس کے جہازی سائز گھر سے بھی

"بیٹھئے نا۔" وہ بڑی رسانیت سے بولی۔

"کیسی ہیں آپ۔" وہ قدرے ہٹ کر صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

"پاؤں خراب ہے خود تو ٹھیک ہوں۔" وہ مسکرائی۔

وہ چند لمحے بڑے ادب سے اس کی احوال پرسی کرنے کے بعد کام کی باتیں کرنے لگا۔ پیمنٹس کے لئے جتنی رقم درکار تھی وہ اس نے فائیل میں سے دیکھ کر ربیعہ کو بتا دی۔

ربیعہ نے نوکر سے کہہ کر اپنا بریف کیس منگوایا اور مطلوبہ رقم کا چیک عاصم کو دے دیا۔

عاصم چیک لے کر اٹھنے لگا تو وہ بولی۔ "بیٹھئے نا..... آپ صرف چیک لینے ہی

www.freepdfpost.blogspot.com

آئے تھے کیا....."

وہ کچھ نادم سا ہو کر بیٹھ گیا۔

"آپ میرے گھر آئے ہیں..... چائے وائے تو چلے گی۔"

"میڈم آپ تکلیف نہ کریں....."

"دیکھئے عاصم صاحب یہ میرا گھر ہے دفتر نہیں۔" وہ مسکراتے ہوئے بولی "اور گھر میں مجھے میڈم کہلوانا اچھا نہیں لگتا۔ اور اب ویسے بھی آپ نئی فیکٹری کے خود مختار مینجر ہے۔ میں آپ کی بوس نہیں ہوں اب....."

وہ سر جھکائے بیٹھا مسکراتا رہا....."

"میرا نام ربیعہ ہے۔ ربیعہ مجید....."

"جی میں جانتا ہوں۔"

"آفس سے باہر اور خاص کر اس گھر میں مجھے سب ربیعہ ہی کہتے ہیں۔"

وہ خاموش رہا.....

"آج آپ گھر آئے ہیں۔ تو میں آپ کو اپنی امی سے بھی ملواؤنگی..... ملنا چاہیں گے؟"

"جی..... جی....." وہ مودبانہ بولا۔ "ان سے ملنا میرے لئے سعادت ہو گی....."

"ٹھیک تو پھر آرام سے بیٹھئے..... چائے ہم تینوں اکٹھی پئیں گے۔"

ربیعہ نے نوکر کو بلایا اور چائے لانے کا کہا....." جلدی سے چائے لے آؤ اور ہاں امی سے کہنا۔ کوئی ان سے ملنے آیا ہے۔ جلدی سے ادھر آ جائیں.....

"میڈم..... میں" عاصم نے کچھ کہنا چاہا تو وہ جھٹ سے بولی پھر میڈم؟ میرا نام ربیعہ ہے۔"

وہ اسے ربیعہ کہہ کر نہ بلا سکا۔ آپ ہی پر اکتفا کرتے ہوئے بولا۔ آپ چائے کی زحمت نہ ہی کرتیں۔ مجھے پیمنٹس کرنی ہیں..... جلدی میں ہوں۔"

"امی سے نہیں ملیں گے۔

"میں انہیں ادھر ہی سلام کر لیتا۔"

نہیں صاحب۔ آپ کو یہاں بیٹھنا پڑے گا۔"

وہ بے تکلف ہو کر باتیں کرنا چاہتی تھی۔ اور عاصم محتاط انداز اختیار کر رہا تھا۔

چائے آ گئی۔

اور

کچھ ہی دیر بعد ربیعہ کی امی آ گئیں۔ ان کی شخصیت بڑی پروقار تھی۔ عاصم نے اٹھ کر ان کا استقبال کیا۔ پھر بڑی ہی سعادت مندی سے سر جھکاتے ہوئے انہیں سلام کیا..... ربیعہ نے عاصم کا تعارف کروایا۔

چائے کے دوران ہلکی پھلکی گفتگو ہوئی..... ربیعہ دفتری ماحول سے الگ ہو کر عاصم کو امی سے ملانے کی خواہش مند تھی۔ اس لئے فیکٹری یا آفس کے متعلق اس نے دانستہ کوئی بات نہیں کی۔

عاصم بڑا سنبھل سنبھل کر باتیں کر رہا تھا..... انداز بھی محتاط تھا۔ ادب و احترام بھی ملحوظ خاطر تھا۔ وہ ربیعہ سے کئی بار بے تکلفی سے بھی ذاتی قسم کی باتیں کر لیتا تھا۔ لیکن اس وقت وہ جھجک رہا تھا۔ ربیعہ اس کی جھجک پر زیر لب مسکرائے جا رہی تھی۔

وہ آدھ گھنٹہ وہاں رہا..... ربیعہ کی امی نے اس کے گھر بار اور امی کے بارے میں پوچھا۔ شفو کے متعلق بھی استفسار کیا..... عاصم نے ہر بات کا جواب بڑی سنجیدگی اور سچائی سے دیا..... اپنے چار مرلے کے گھر کا بھی بتایا..... اور اپنے ابو کے لاپتہ ہونے کا بھی..... امی کی محنت کا بتاتے ہوئے بھی اس نے کوئی عار محسوس نہ کی.....

"وہ عظیم عورت ہیں....." ربیعہ نے کہا اس کی امی چپ ہی رہیں۔

"شکریہ۔" عاصم نے کہا۔

"کسی دن ملائیے نا اپنی امی سے۔"

"جی ضرور..... کبھی کوئی موقعہ آیا تو ضرور ملاؤں گا۔"

"میں اپنے گھر کسی فنکشن پر انہیں بلاؤں تو آئیں گی۔"

"ضرور آئیں گی....."

www.freepdfpost.blogspot.com

"ٹھیک ہے....." ربیعہ بولی "مجھے خوشی ہو گی۔ کہ ہم لوگ دفتروں سے ہٹ کر بھی ملتے رہیں....."

"شکریہ۔" عاصم نے کہا۔

ان کی باتوں کے دوران ربیعہ کی امی زیادہ تر خاموش ہی رہیں۔

عاصم چند منٹ اور رکا۔ پھر اجازت لی اور چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد ربیعہ نے مسکراتی نظروں سے ماں کی طرف دیکھا اور بولی۔ "عاصم آپ کو کیسا لگا....."

"اچھا آدمی ہے....."

"صرف اچھا....."

"تو اور....."

"ربیعہ چند لمحے سر نیہوڑائے بیٹھی رہی۔ پھر مسکراتی نظروں سے ماں کی طرف دیکھ کر بولی۔ "امی..... عاصم بہت ہی ٹیبل اور با صلاحیت نوجوان ہے۔ اس کے اخلاق و کردار کی میں معترف ہوں۔ ہاں اس کا دولت والا خانہ خالی ہے....."

"اور یہ ایسی بات نہیں ربیعہ جیسے نظر انداز کر دیا جائے۔" امی اس کی باتوں اور مسکراہٹ سے پہلے ہی سمجھ گئی تھی کہ وہ اس نوجوان میں دلچسپی لے رہی ہے۔

"حد ہو گئی امی....."

"میرا تجربہ تم سے کہیں زیادہ ہے ربیعہ..... ایسے نوجوان جو اپنا آپ خود بناتے ہیں..... اپنی انا کے معاملے میں بڑے حساس ہوتے ہیں....."

وہ ماں کو دیکھ کر ادائے دلفریبی سے مسکرائی۔ "آپ جو کہنا چاہ رہی ہیں میں سمجھتی ہوں....."

"پھر....."

"امی..... کیا میری دولت صرف میری رہے گی..... میرے لائف پارٹنر کا اس پر کوئی حق نہ ہو گا..... کیا یہ کروڑوں روپے صرف میرے ہی لئے ہوں گے..... امیر عورت سے صرف امیر مرد ہی شادی کر سکتا ہے۔؟"

"میں نے تمہیں پہلے بھی کہا ہے ربیعہ..... امیر بیوی کا غریب شوہر احساس کمتری کا شکار ہو جاتا ہے۔ اور احساس کمتری کا شکار مرد....."

"تو گویا میرا امیدوار..... کسی دولتمند کے سوا کوئی ہو ہی نہیں سکتا۔" وہ ہنس کر بولی۔

"ہو تو سکتا ہے۔" امی نے سنجیدگی سے کہا۔ "لیکن خوشگوار ازدواجی زندگی گزارنا ہے۔ تو ہونا نہیں چاہئے۔

"یعنی....."

"مخمل میں ٹاٹ کا پیوند نہ لگتا ہے نہ ہی زیب دیتا ہے۔"

"آپ کا مطلب تو یہ ہوا امی..... کہ اخلاق و کردار اور شکل و صورت کی ساری خوبیاں ایک طرف اور دولت ایک طرف

"میں تم سے بحث نہیں کرنا چاہتی..... لیکن پھر بھی بتا دوں..... کہ جس نوجوان میں تم دلچسپی رکھتی ہو..... وہ ہزار خوبیوں کا مالک سہی..... کنگال شوہر بن کر کبھی اچھا ثابت نہیں ہو سکتا....."

"اس کے پاس پیسہ بھی ہونا چاہئے؟"

"تمہارا ہاتھ تھامنا چاہے تو یہ بہت ضروری ہے۔"

وہ امی کی بات پر کھلکھلا کر ہنس پڑی..... پھر سنجیدگی سے بولی۔ "میں نے بہت سے لوگوں کو دیکھا ہے امی۔ عاصم دی بیسٹ ہے۔ اب یہ دوسری بات ہے۔ کہ....." وہ چپ ہو گئی..... اس کے ذہن میں اک نئی سوچ ابھری امی نے بھی کوئی بات نہیں کی..... وہ بھی سوچوں میں گم تھیں۔

www.freepdfpost.blogspot.com

"وکیل صاحب۔ آپ نے پوری جانچ پڑتال کر لی نا....."

"جی ہاں..... میں چار دن دوبئی میں رہا۔ عاصم کے والد قاسم وہاں خاصے پیسے والے تھے۔ وہ ایک عرب تاجر سے مل کر بزنس بھی کرتے تھے۔ اب سارا پیسہ اور بزنس ان کی ایرانی بیوی اور سالے کے پاس ہے۔

"مجھے اس سے غرض نہیں..... میں نے جو پلان آپ کو دیا تھا۔ کیا عملی جامہ پہنایا جا سکتا ہے۔

"بالکل پہنایا جا سکتا ہے....."

"آپ نے سارے کوائف اکٹھے کر لئے۔"

"ہاں۔ سارے کاغذات تیار ہیں۔"

"وہ کوٹھی بھی خرید لی۔"

"بھئی روڈ والی آپ نے پسند کی تھی۔ وہی خرید لی ہے۔ بیعانہ ہو گیا ہے رجسٹری کروانی ہے۔"

"کوٹھی عاصم کے نام پر ہو گی نا....."

"سب کچھ اسی کے نام ہو گا..... اور یہ سب کچھ اس کے مرحوم والد قاسم کی طرف سے ہو گا۔ وصیت کی کاپی میں نے بنا لی ہے....."

"سارا کام احتیاط سے ہو..... اور بات صیغہ راز میں رہے۔ میں نہیں چاہتی کہ عاصم کو پتہ چلے کہ یہ سب کچھ اس کے لئے میں نے کیا ہے۔"

"بے فکر رہیں مس مجید۔ میں سب سمجھتا ہوں۔ عاصم یا کسی اور کے وہم و

گمان میں بھی نہیں آئے گا کہ یہ سب کچھ اسے آپ کی طرف سے مل رہا ہے۔ کاغذات اس طرح بنائے ہیں۔ کہ۔"

"اچھا..... ٹھیک ہے۔"

"آپ اطمینان رکھیں مس مجید..... ہر کام احتیاط سے کیا جائے گا..... میں نے مسٹر یاور بخت سے کہہ دیا ہے۔ وہ عاصم سے قاسم کے وکیل کی حیثیت سے مل کر اسے یہ سب کچھ دے گا۔

"پیسہ تو بنک میں جائے گا نا....."

"جی ہاں....."

"ڈالرز کی صورت میں۔"

"بالکل..... باہر سے ڈالرز میں پیسہ بھجوانے پر ان دنوں کوئی پابندی نہیں۔ اس لئے کیس کو زیادہ موثر بنانے کے لئے پیسہ بنک میں ڈالرز کی صورت میں منتقل کرنا بہتر ہو گا۔

"ٹھیک ہے....."

"آپ باہر سے پیسہ ٹرانسفر کریں گی۔"

"ہاں..... اس میں کچھ دن لگ جائیں گے۔"

"تب تک کوٹھی کی پیمینٹ بھی ہو جائے گی۔"

"وکیل صاحب..... ساری بات صیغہ راز میں رہے....."

"آپ بے فکر رہیں بی بی..... میں آپ لوگوں کا پرانا نمک خوار ہوں..... مجید مرحوم کے تو مجھ پر بڑے احسانات بھی ہیں..... پھر آپ کا بھی تو میں قانونی مشیر ہوں..... اور وہ یاور بخت جو وکیل ہے نا اصل بات تو میں نے اسے بھی نہیں بتائی..... اس کی خدمت صرف یہ پیسہ اور کوٹھی عاصم صاحب تک پہنچانے کے لئے حاصل کی ہیں۔ میں خود بھی قاسم کے وکیل کی حیثیت سے اسے مل سکتا تھا۔ لیکن اس میں خدشہ تھا۔ کہ آپ کا قانونی مشیر ہونے کی وجہ سے عاصم کو کوئی گمان نہ گزرے۔ اب تو یاور بخت کرے گا سب کچھ۔

www.freepdfpost.blogspot.com

"ہوں۔"

ربیعہ نے اپنے قانونی مشیر کو بلایا ہوا تھا۔ اور اس سے رازداری کی باتیں کر رہی تھی۔

عاصم اسے ہر لحاظ سے پسند تھا..... اور وہ یہ بھی جانتی تھی کہ عاصم بھی اسے ناپسند نہیں کرتا..... ہم جب خواہشوں کے اسیر ہو جاتے ہیں۔ تو ہر بات کو اپنے ہی چوکھٹے میں فٹ کر کے دیکھتے ہیں۔ اپنے آپ میں اپنی خواہشوں کے ڈھیر تلے اس طرح دب جاتے ہیں۔ کہ ہمیں ارد گرد اور کچھ دکھائی ہی نہیں دیتا۔ ہر بات کے معنی ہم اپنی خواہش کے سانچے میں ڈھالتے ہیں۔ ہر فصل کو اپنی آرزو کے پیمانے سے ناپتے ہیں۔ اور اس طرح ساری کی ساری خوشیاں اپنے حصے میں ڈال کر ہمیں لگتا ہے۔ کہ ہم نے دامن بھر لیا۔

لیکن

اکثر ایسا نہیں بھی ہوتا..... خوشیاں جن چوکھٹوں میں ہم نے فٹ کی ہوتی ہیں۔ ان کا صرف تصوراتی وجود ہوتا ہے۔ سانچے اور پیمانے فرضی ہوتے ہیں۔

اور

بھرے دامن خالی ہوتے ہیں۔ ان میں کچھ نہیں ہوتا..... صرف اور صرف ہمارا تخیل ہوتا ہے۔ حقیقت سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

ربیعہ نے بھی عاصم کے متعلق کچھ ایسی ہی خواہشیں پال رکھی تھی۔ کچھ واقعات ایسے ہوئے تھے۔ جنہیں اس نے عاصم کی پسندیدگی کی چھاپ لگا کر اپنے فریموں میں فٹ کر لیا تھا..... عزت اور احترام جو عاصم اسے بڑھ چڑھ کر دیتا تھا۔ اسے ربیعہ نے خاموش پسندیدگی سے تعبیر کیا تھا۔

اس نے اپنی خوشگوار سی خواہش کا امی سے بھی ذکر کیا تھا..... امی کو عاصم ناپسند نہیں تھا۔ لیکن وہ اپنے تجربے اور مشاہدے کی بنا پر اس کی مخالفت کر رہی تھیں..... امیر عورت کا غریب شوہر ہمیشہ احساس کمتری کا شکار ہوتا ہے۔ وہ بار بار ربیعہ کو یہ کلیہ سمجھانے کی کوشش کرتی تھیں۔

تب ہی

ربیعہ کے ذہن میں اک سوچ ابھری تھی۔ اور کئی دن سنجیدگی سے اس سوچ کے ساتھ نبرد آزما ہونے کے بعد اس نے یہ فیصلہ کیا تھا۔

عاصم ہزار خوبیوں کا مالک تھا.....

اک دولت ہی تو نہیں تھی نا۔ یہ خانہ ہی خالی تھا باقی تو سب کچھ ٹھیک تھا۔

اور

وہ

خود

www.freepdfpost.blogspot.com

کروڑوں کی مال تھی۔ یہ خالی خانہ وہ خود بھی تو بھر سکتی تھی۔

اس طرح

کہ

عاصم کی انا بھی مجروح نہ ہو..... اور امی کا خدشہ بھی دور ہو جائے۔

اپنی خوشی اور امی کی تسلی کے لئے اگر کچھ صرف کرنا پڑ بھی جائے۔ تو کونسی بڑی بات تھی۔

عاصم کی تو جیسے لاٹری نکل آئی۔ اچانک اتنی خطیر رقم مل گئی..... اور خوبصورت علاقے میں کوٹھی بھی مل گئی..... اس کی خوشیوں کا ٹھکانہ نہیں تھا۔ ان ہونی سی بات تھی۔ لیکن ہو گئی تھی۔ عاصم تو کیا شفو اور امی بھی خوشی سے جیسے باولی ہو رہی تھیں..... امی جو شوہر کو اٹھتے بیٹھتے کوسنے دینے کی عادی تھیں۔ اب اسے یاد کر کے آنسو بہانے لگی تھیں۔ اس کی خوبیوں کو یاد کر کر کے آہیں بھرنے لگی تھیں

اور

ان کی دیکھا دیکھی عاصم اور شفو کو بھی مرحوم ابو کی یاد ستانے لگی تھی۔ جنہوں نے عمر بھر تو ان کی شکلیں نہ دیکھیں لیکن پیسے کے معاملے میں میں ان کا حق نہیں مارا۔ وصیت کر گئے۔ قانونی تحفظ دے گئے۔ اسی لئے تو ان کی ایرانی بیوی اس معاملے میں کچھ نہ کر سکی.....

کئی دن تو گھر میں مسرور سا ہنگامہ رہا۔ دوست عزیز رشتے دار مبارکیں دینے چلے آ رہے تھے۔ خالہ سلمٰی اور خالو سجاد کی خوشیوں کا بھی ٹھکانہ نہیں تھا۔ ان کی بیٹی کی قسمت بڑی یاور تھی۔

"وہ تو عاصم کی اتنی اچھی نوکری پر ہی پھولے نہ سماتے تھے۔ اس پر بیٹھے بٹھائے، وہ ایک دم ہی اتنا اونچا اٹھ گیا تھا....."

جتنی بھی خوشیاں منائی جاتیں کم تھیں۔ کئی دن گھر میں جشن کا سا سماں رہا۔ عاصم تو ہفتہ بھر کی چھٹی لے کر گھر بیٹھ گیا..... خوشیوں کا بار سنبھلتے۔ نہیں سنبھل رہا تھا.....

www.freepdfpost.blogspot.com

PdfStuff.blogspot.com

جب کچھ ہوش و حواس ٹھکانے پہ آئے تو عاصم شفو اور امی پلان بنانے لگے۔ اماں تو بیٹے کی شادی ایک دم ہی کرنے کے خیال میں مگن تھیں۔ شفو کو نئی کوٹھی میں اٹھ جانے کی جلدی تھی۔ نئی کوٹھی کو نئی نئی چیزوں سے سجانے کا جنون تھا۔

اور

عاصم سوچ رہا تھا۔ کہ کیوں نہ وہ اپنی فیکٹری لگا لے۔ وہ اونچ نیچ جان چکا تھا۔ ٹریننگ بھی لے رکھی تھی۔ ربیعہ کی نئی فیکٹری کا سارا نظام وہ کر رہا تھا..... اب اس کے لئے اپنی فیکٹری لگانا اور اسے چلانا کوئی مشکل کام نہ تھا.....

امی اپنی خواہش کی تکمیل کریں اسے بھلا کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔

شفو اپنی من مانی کر لے۔ اس کی بھی گنجائش تھی۔

لیکن

عاصم فیکٹری کا پلان بھی سنجیدگی سے بنانے لگا۔ اور چند دنوں میں اس نے زمین بھی دیکھ لی اور بنک سے لون لینے کے ذرائع بھی معلوم کر لئے۔ اپنی انو سمینٹ کے ساتھ گورنمنٹ سے معقول رقم بھی مل سکتی تھی۔ وہ بڑے پیمانے پر فیکٹری لگا سکتا تھا۔

امی اپنے کام میں لگ گئیں..... سلمٰی کو بھی شادی کی تیاری کا کہہ دیا۔ شفو نئی کوٹھی کو سجانے بنانے لگی اور عاصم اپنے کام میں سنجیدہ ہو گیا۔

ربیعہ کو اس نے یہ خوشخبری سنائی۔

"مبارک ہو۔ مبارک ہو۔" وہ اس کی خوشی کی گہرائیوں اور گیرائیوں کو محسوس کرتے ہوئے بولی۔ اس نے دیکھا کہ عاصم کا چہرہ جگمگا رہا تھا۔ اور اس میں خود اعتمادی جس کا فقدان وہ محسوس کیا کرتی تھی بھر گئی تھی۔ اس نے آج اسے مس ربیعہ کہہ کر پکارا تھا۔

وہ خوش تھی..... بہت خوش..... شاید امی یہی چاہتی تھیں۔ مرد میں خود اعتمادی پیدا ہو جائے تو یہ اس کا جوہر بن جاتا ہے۔

وہ دونوں کچھ دیر باتیں کرتے رہے۔ اپنے باپ کے لئے عاصم کے دل میں احترام پیدا ہو گیا تھا۔

"ہم تو یہی سمجھے تھے کہ وہ ہمیں بھلا بیٹھے ہیں۔ لیکن انہوں نے ہمیں یاد رکھا تھا۔ ایرانی بیوی کو چکر دے دیا ہو گا۔ ورنہ وہ ہم سے اتنے برسوں بیگانہ نہ رہتے۔

"چلو یہی شکر کی بات ہے۔ اپنے اثاثوں میں سے انہوں نے تم لوگوں کا حصہ الگ کر دیا تھا....."

"شکر جیسا شکر بولا۔ ہم لوگوں نے تو کبھی سوچا بھی نہ تھا....."

"اب آپ کا کیا ارادہ ہے۔ اتنے پیسے کا کیا کریں گے....."

وہ خوشی سے چہکتے ہوئے بولا۔ "مس ربیعہ..... ہم گھر کے تین فرد ہیں۔ امی شفو اور میں۔ اب ہر کوئی اپنے پلان بنا رہا ہے....."

"سنو تو....." وہ مسکرائی

www.freepdfpost.blogspot.com

"دیکھیں نا..... امی کو ہر ماں کی طرح بیٹے کے سہرے کے پھولوں کا ارمان ہے۔ انہیں میری شادی کی جلدی ہے۔"

"ربیعہ کے گال تمتما اٹھے..... اس نے عاصم کو دیکھا وہ بڑے خوبصورت انداز میں مسکرا رہا تھا۔

شفو کو نیا گھر سجانے بنانے کی لگن۔ وہ چند لمحے بعد بولا۔

"اور آپ کو۔" ربیعہ نے تجسس سے پوچھا

میں..... میں..... اگر آپ مائنڈ نہ کریں تو بتاؤں..... وہ کرسی میں آگے کو جھکتے ہوئے چند لمحے اسے دیکھنے کے بعد بولا۔

"مائنڈ کیوں کروں گی..... ہم بے تکلف دوست ہیں....." وہ ادائے دلفریبی سے مسکرائی۔

عاصم کا چہرہ شگفتہ ہو گیا۔ مسکراتی نگاہ اس پر ڈالی۔ "شکریہ مس ربیعہ....."

"صرف ربیعہ....." وہ چہکی

نہیں ابھی نہیں ابھی میں آپ کا ملازم ہوں وہ اسی رو میں کہہ گیا اور ربیعہ کے من میں نقرئی گھنٹیوں کی کھنک گونج گئی

پھر

عاصم اسے اپنے پلان کے متعلق بتانے لگا

"خوشی کی بات ہے۔" ربیعہ بولی "لیکن میری فیکٹری کا کیا بنے گا....."

"میں اس کی سپرویژن بھی کروں گا....." وہ جلدی سے بولا..... "آپ کو چھوڑوں گا نہیں....."

وہ اس کی بات پر ادائے دلفریبی سے مسکرا دی۔

"امی۔"

"ہوں۔"

"آپ خوش ہیں نا۔"

"ہاں....."

"اب تو عاصم کو امیر عورت سے شادی کر کے کوئی کمپلکس نہیں ہو گا نا..... وہ تو اب اپنی فیکٹری لگا رہا ہے امی..... اس کے ابو اس کے نام اتنا چھوڑ گئے ہیں۔ کہ وہ فیکٹری آسانی سے لگا سکتا ہے۔"

"اچھی بات ہے۔"

"اور وہ بڑا پشنگ بھی ہے امی..... اس کے من میں کام کرنے کی لگن ہے آگے بڑھنے کا شوق ہے اور جب وہ میرا کام اتنی محنت اور لگن سے کر سکتا ہے تو پھر اپنا کام..... تو کرے گا ہی..... مجھے امید ہے جب وہ بہت ترقی کرے گا....."

"خدا کرے۔"

"آپ اس سے تین چار بار مل چکی ہیں امی۔ آپ اب بھی گومگو کے عالم میں ہیں۔ سر پھرے دو لتے آپ کے ذہن سے ابھی تک نہیں نکلے....."

"نہیں بیٹی..... میں ان لوگوں سے تمہاری طرح خود بھی خائف ہوں....."

"عاصم کے متعلق کیا خیال ہے۔"

وہ بہت اچھا آدمی ہے..... لیکن....."

ابھی بھی لیکن کی گنجائش ہے ....."

www.freepdfpost.blogspot.com

"ہاں ربیعہ..... گنجائش کیسے نہیں۔ قدم اب اسے اٹھانا ہے۔ وہ یا اس کی امی تمہارے لئے دامن پھیلائیں۔ تو میں ان کی جھولی خالی تو نہیں رکھوں گی۔

"اوہ امی۔ ربیعہ نے ماں کے گلے میں بانہیں ڈال کر اس کے گال پر پیار کر لیا..... اور بولی وہ کل ہی کہہ رہا تھا امی....."

"کیا" امی نے بھی ربیعہ کو پیار کر لیا۔

"کہ اس کی امی اس کی شادی کی تیاریوں میں لگی ہیں....."

"ہمارے ہاں کب آ رہی ہیں....."

ربیعہ پرے ہٹ کر بیٹھتے ہوئے بولی "میرا ارادہ تھا اسے اپنی برتھ ڈے کی تقریب میں مدعو کروں گی لیکن پتہ ہے امی اس نے کیا کہا....."

"کیا؟....."

"وہ کہنے لگا..... برتھ ڈے میں ابھی بہت دن ہیں۔ وہ اور امی کل ہی آ رہے ہیں۔ ساتھ اس کی بہن شفو بھی آئے گی۔ اسے مجھ سے ملنے کا بہت شوق ہے....."

"تو ٹھیک ہے۔ کل میں ان کا انتظار کروں گی....."

ربیعہ نے پھر ماں کے گلے میں بانہیں ڈال دیں..... وہ بہت خوش تھی..... اس کی خوشی ماں کی خوشی تھی..... ماں نے بھی اسے لپٹا کر پیار کر لیا.....

عاصم کی امی تو تیار ہو گئی تھیں۔ کریم کلر گرم سوٹ پہنا تھا۔ کشمیری کڑھائی والی شال کندھوں پر ڈالی تھی اور عاصم کے لندن سے لائے ہوئے سویٹر کو بھی زیب تن کیا تھا۔ اس لباس میں وہ بڑی پروقار اور معتبر لگ رہی تھیں۔

عاصم اور شفو تیار ہو رہے تھے۔ عاصم نے ریڈی میڈ فان کلر کو مینیشن خریدا تھا۔ وہ پہن کر گلے میں میچ کرتا سکارف باندھ رہا تھا۔ آئینے میں اپنی صورت دیکھ دیکھ کر خوش ہو رہا تھا۔ پیسہ بھی کیا شے ہے۔" وہ دل ہی دل میں پیسے کی اہمیت اور افادیت کا اعتراف کر رہا تھا۔ پہلے بھی وہ تین چار دفعہ ربیعہ کے ہاں جا چکا تھا۔ لیکن کبھی اعتماد کے ساتھ وہاں نہیں گیا تھا۔ اک خوف اک جھجک ملازم ہونے کا دباؤ آمیز احساس اس کے حواس پر ہمیشہ چھایا رہتا تھا۔ کھل کر بات کرنے کی بھی ہمت نہ ہوتی تھی۔ حالانکہ ربیعہ بے تکلفی برتتی تھی۔ اور مالک و ملازم کے تعلق کو گھر کی فضا سے ہی دور رکھنے کی کوشش کیا کرتی تھی۔

لیکن آج وہ اپنے آپ کو بالکل بدلا ہوا پا رہا تھا۔ وہ اس کے گھر جا رہا تھا۔ ملازم کی حیثیت سے نہیں۔ ایک دوست کی حیثیت سے۔ اعتماد کے ساتھ' خلوص کے ساتھ..... وہ اب کنگال عاصم نہیں تھا۔ ایک کینال کی خوبصورت کوٹھی کا مالک تھا۔ جس کا بنک بیلنس ناکافی نہیں تھا۔ اور جو اپنی نئی فیکٹری کی بنیادیں رکھ رہا تھا۔ وہ اس راہی کی طرح تھا جو ٹیڑے میڑھے کچے پتھریلے اور غیر ہموار راستے سے ایک دم ہی سرمئی پھیلی ہوئی سڑک پر آ گیا ہو۔ اور جسے اپنی جگمگاتی منزل صاف نظر آنے لگی ہو.....

"امی آپ تو تیار ہو گئیں۔ یہ شفو ابھی تک تیار نہیں ہوئی۔" وہ ماں کے

www.freepdfpost.blogspot.com

قریب آتے ہوئے بولا۔ شنو" امی نے اسے آواز دی۔

آ رہی ہوں امی بس ایک منٹ وہ اپنے کمرے ہی سے بولی..... عاصم اس کے کمرے میں چلا آیا۔ شفو نے جدید فیشن کے خوبصورت کپڑے پہن رکھے تھے اور وہ اپنے بالوں کو سنوارنے میں لگی ہوئی تھی۔

بھئی چلو بھی۔ وہ بولا۔

تیار تو ہو لوں۔ پتہ تو ہے کس کے ہاں جا رہے ہیں۔ جناب ممی صاحب ہمیں بھی پورے اعزاز کے ساتھ اس کے ہاں جانا ہے۔ اب ہم کسی سے کم تو نہیں....." وہ شان تفاخر سے سر اٹھاتے ہوئے شوخی سے بولی۔

"بی بی" عاصم نے کہا" اس کا ہمارا اب بھی کیا مقابلہ..... اس کا گھر دیکھو گی تو بے ہوش ہو جاؤ گی۔ وہ بھی ہنسا۔ ٹھیک ہے۔ آرائش کا کوئی آئیڈیا ہی آ جائے گا۔ میں بھی اپنا گھر نمبر ون کر کے ہی دم لوں گی۔ اچھا اچھا باتیں نہیں بناؤ..... جلدی کرو..... واپس آ کر بھی بہت سے کام کرنا ہیں....."

"امی نے مٹھائی منگوائی۔"

کیا مٹھائی بھی لے جا رہے ہو تم لوگ"

تو کیا خالی ہاتھ جائیں گے۔ پہلی دفعہ تو جا رہے ہیں۔ دس کلو لڈو بنوائے ہیں امی نے۔

"اوہو..... ان کی کیا ضرورت تھی۔"

"آپ کو نہیں پتہ..... امی نے جو کچھ کیا ہے ٹھیک کیا ہے....."

"عاصم باہر نکل آیا۔ لڈوؤں کا ٹوکرا دیکھ کر اس نے امی سے بھی کہا "اس کی کیا ضرورت تھی امی۔" ہم پہلی بار ان کے ہاں جا رہے ہیں بیٹے..... اور پھر اس موقع پر..... مٹھائی تو لے کر جانا ہی تھی۔

عاصم چپ ہو گیا.....

"شفو بن سنور کر باہر آ گئی۔ وہ بہت پیاری لگ رہی تھی..... عاصم نے اسے چھیڑا "اے تیری تو شکل نکل آئی ہے۔ اچھی خاصی ہو..... میں تو چڑیل ہی سمجھتا تھا تمہیں....."

"وہ خوش دلی سے ہنس پڑی....."

ربیعہ اور اس کی امی نے مہمانوں کا استقبال شان شایان طریق سے کیا۔ انہیں اپنے خوبصورت آراستہ پیراستہ ڈرائنگ روم میں بڑی عزت اور احترام سے لا کر بٹھایا۔ عاصم اس کی امی اور شفو ان کی امارت سے تو مرعوب ہوئے ہی تھے۔ ان کی انکساری محبت اور رکھ رکھاؤ سے بے حد متاثر ہوئے۔ ان کو خیال تک نہیں آیا تھا۔ کہ ان کی پذیرائی اس طرح ہو گی۔

شفو ربیعہ سے باتیں کرنے لگی۔ آتے وقت جو اس کے اندر ہی اندر جھجک تھی وہ دور ہو چکی تھی۔ اور وہ ربیعہ باجی ربیعہ باجی کہتے ہوئے اس کے ساتھ گرمجوشی سے گپ شپ لگا رہی تھی۔

عاصم اور امی پاس پاس بیٹھے تھے۔

اور

ربیعہ کی امی ان سے اس انداز میں باتیں کر رہی تھیں۔ جیسے وہ کوئی بے انتہا اہم اور معتبر لوگ ہوں۔ انہوں نے خاطر تواضع میں بھی بخل سے کام نہیں لیا۔ چائے تو ابھی تیار ہو رہی تھی۔ ڈرائے فروٹ اور پھل وغیرہ ان کے سامنے وافر مقدار میں رکھ دیئے تھے۔ اور بڑے اصرار سے انہیں کھانے کے لئے کہہ رہی تھیں.....

باتوں ہی باتوں میں ربیعہ کی امی نے کہا "مٹھائی کی کیا ضرورت تھی آپ نے ناحق تکلف کیا۔

عاصم کی امی دھیرے سے مسکرائیں عاصم کی طرف دیکھا اور بولیں "تکلف کیسا۔ ہم لوگ پہلی بار آپ کے ہاں آئے ہیں..... اور ایسے موقع پر آئے ہیں۔ مٹھائی ضروری ہی تو تھی....."

www.freepdfpost.blogspot.com

ربیعہ کا چہرہ گلگوں ہو گیا۔ اس نے کن انکھیوں سے عاصم کو دیکھا..... جو اپنا سکارف ٹھیک کرتے ہوئے بڑا ہی جاذب اور پرکشش لگ رہا تھا۔

"آپ کی خوشی" ربیعہ کی امی نے شکریے کے طور پر کہا۔

"ہم آپ کے ہاں آئے ہیں۔ اب آپ بھی ہمارے غریب خانے پر تشریف لائیے گا۔" عاصم کی امی نے کہا "ضرور ضرور....." ربیعہ کی امی بولیں" ملنے جلنے سے محبت بڑھتی ہے۔ ضرور آئیں گے ہم بھی..... موقعہ ملا تو۔

"موقعہ قریب ہی ہے۔" عاصم کی امی ہنسیں اور پھر اپنے ہینڈ بیگ سے ایک کارڈ نکال کر ربیعہ کی امی کی طرف بڑھاتے ہوئے بولیں "چھبیس کو عاصم کی شادی ہے۔ آپ دونوں ضرور آئیے گا۔ بلکہ رسم حنا میں بھی آپ کی شمولیت ضروری ہے ہمیں بے حد خوشی ہو گی....."

عا..... صم..... کی شادی....." ربیعہ کی امی کی زبان لڑکھڑائی۔ وہ کارڈ ہاتھ میں نہ لے سکیں "جی ہاں۔ ربیعہ کی امی خوشی سے بولیں۔" میری بھانجی سے اس کی نسبت طے تھی سوچا اب اس فرض سے فارغ ہو ہی جاؤں تو اچھا ہے۔ آپ بھی آئیے گا ربیعہ....."

عاصم کی امی نے سر گھما کر دوسرے صوفے پر شفو کے پاس بیٹھی ربیعہ کی طرف مسکرا کر دیکھا

لیکن

ربیعہ.....

وہ تو عاصم کی شادی کا سن کر سن ہی ہو چکی تھی۔ اسے تو جیسے نہ کچھ دکھائی دے رہا تھا۔ نہ سنائی محسوس کرنے کی حس بھی شاید ختم ہو گئی تھی۔

وہ تو

وہ تو

اس شہزادی کی طرح لگ رہی تھی جسے کسی ظالم نے جادوئی الفاظ سے پتھر کی بنا دیا ہو۔

خواہش

دھواں کھائی چھت اور بے رنگ جگہ جگہ سے قلعی اکھڑی دیواروں والی کوٹھڑی میں جھلنگا سی چارپائی پر آلتی پالتی مارے ابا بیٹھا تھا۔ اماں ایک طرف رکھی لوہے کی ٹوٹی پھوٹی پیٹی پر رکھے ریکسین کے پرانے سوٹ کیس کو کھولے اس پر جھکی کھڑی تھی۔ کوٹھڑی کی کل کائنات یہ پیٹی دو ایک صندوق اور جھلنگا سی دو چارپائیاں تھیں۔ جو دیوار کے ساتھ لگا کر بچھائی ہوئی تھیں۔ دونوں چارپائیوں کے درمیان بمشکل گزرنے کا راستہ بچتا تھا۔ فرش جگہ جگہ سے اکھڑا ہوا تھا۔ اور جگہ جگہ چھوٹے چھوٹے گڑھے پڑے ہوئے تھے۔ جن میں ابا نے کئی دفعہ بجری سیمنٹ کی ٹوکریاں بھر بھر کر ڈالی تھیں۔ یہ بجری سیمنٹ ابا ان مکانوں کے آگے سے اٹھا لاتا تھا۔ جو زیر تعمیر تھے۔ یا جو بن چکے تھے۔ اور یہ فاضل بجری سیمنٹ چونکہ بیکار ہوتا تھا۔ اس لئے کوڑے کی طرح ڈھیروں کی ڈھیر سڑک کے کنارے ڈال دیا جاتا تھا۔ کوٹھری کی سامنے والی دیوار پر لکڑی کی چھتی بنی ہوئی تھی۔ جس پر کچھ پیتل تانبے اور کچھ چینی کے برتن سجے رہتے تھے۔ دیواروں پر چونا پھیرنے کی استطاعت تو نہ تھی۔ ہاں ان برتنوں کو اماں پر دوسرے تیسرے مہینے اتروا کر ہم بہنوں سے منجھوایا کرتی تھی۔ ہم دونوں بھی ریت اور راکھ سے رگڑ رگڑ کر ان برتنوں کو اس طرح چمکا دیا کرتی تھیں کہ کئی دن کوٹھری میں دیا جلانے کی ضرورت نہ رہتی۔

ہم لوگ اس کوٹھری میں جانے کب سے رہتے چلے آ رہے تھے۔ مجھے تو لگتا تھا۔ صدیاں اوپر سے گزر گئی ہیں۔ نہ ہم بدلے ہیں نہ کوٹھری اور نہ ہی اس کا یہ سارا سامان۔

www.freepdfpost.blogspot.com

کوٹھڑی کے سامنے چھوٹا سا گھاس پھونس اور درختوں کی شاخوں سے ڈھکا بوسیدہ سا برآمدہ تھا۔ آگے چھوٹا سا صحن پہلے یہ صحن خاصہ بڑا تھا۔ لیکن جب سے دونوں چاچیوں نے درمیان میں دیواریں اٹھا کر اپنی اپنی کوٹھڑیاں الگ کرلی تھیں۔ یہ صحن محدود اور تنگ ہو کر رہ گیا تھا۔ اس صحن کے کچے پکے فرش میں بھی کئی جگہ چھوٹے چھوٹے گڑھے تھے۔ جن میں بجری سیمنٹ بے ترتیبی سے ڈال دیا جاتا تھا۔ صحن کے ایک طرف ہاتھ کا نلکا تھا۔ جس کی ہتھی ہمیشہ ہی ٹوٹی رہتی۔ اور پانی نکالنے کے لئے ہتھی کی جگہ بازوؤں پر زور دینا پڑتا تھا۔ یہیں کھرا تھا۔ جہاں بیٹھ کر نہایا دھویا بھی جاتا۔ کپڑے بھی دھوئے جاتے اور برتن بھی۔ ہانڈی جو کبھی کبھی پکتی اس کے لئے پانی بھی یہیں سے لیا جاتا اور مٹی کا گھڑا جس میں پینے کا پانی ہوتا وہ بھی یہیں سے لیا جاتا۔

یہاں تقریباً سب گھر ایسے ہی تھے۔ محنت کشوں کی بستی تھی۔ یہاں نہ سڑکیں تھیں۔ نہ نالیاں اور نہ ہی گھروں کی کوئی خاص ترتیب..... جہاں جس کو زمین ملی چار دیواریں اٹھا کر چھپر ڈال لیا۔ ہمارے گھر کا بٹوارہ چاچے نہ کرتے تو یہ بستی کا سب سے بڑا گھر ہوتا۔ لیکن خیر اچھا ہی ہوا تھا۔ ہر کوئی اپنے گھر میں حال مست تھا۔ اب نہ اماں اور چاچیوں کی لڑائیاں ہوتیں نہ ابا اور چاچے بات بات پر ایک دوسرے کا گریبان پکڑتے۔ بلکہ اب تو تینوں گھروں میں خاصا پیار ہو گیا تھا۔ بچے بھی ایک لڑائی مار کٹائی نہیں کرتے تھے۔ میرے چاروں چھوٹے بھائی سارا سارا دن ان کے گھروں میں دندناتے پھرتے۔ اماں کی گود والی چنیا تو اب چاچی ہی کے پاس رہتی۔ اور چاچی کا سدھو تو ہمارے گھر ہی کھیلتا رہتا۔

میرا ابا مزدور تھا جب سے میں نے ہوش سنبھالا ابا کو ایسا ہی دیکھا۔ کالی کالی سوکھی سوکھی ٹانگوں چمکتے سیاہ رنگ والے چہرے اور دبلے پتلے جثہ کا ابا میلی سی تہمند بوسیدہ سا کرتا اور سر پر ململ کی برسوں پرانی بے رنگ سی پگڑی رکھے رہتا۔ پاؤں میں جوتا بھی ہمیشہ ہی بوسیدہ اور مٹی میں لت پت ہوتا۔ یہ ابا کے کام والے کپڑے ہوتے تھے۔ جو صبح وہ کام پر جاتے وقت پہنے ہوتا تھا۔ اماں پرانے سے رومال میں کھانے کی پوٹلی بنا کر ابا کو دے دیا کرتی تھی۔

لیکن

ابا کا ایک صاف ستھرا جوڑا بھی ہوتا۔ جو اکثر کھونٹی پر لٹکا رہتا۔ خوشی غمی کے موقعہ پر

جب ابا اپنے عزیزوں رشتہ داروں میں جاتا تو یہ جوڑا پہن کر جایا کرتا تھا۔ تب ابا کے پاؤں میں بوٹ بھی ہوتے تھے اور کندھے پر صاف ستھرا تولیہ بھی.....

ابا بڑا محنتی تھا۔ خود کبھی چھٹی نہ کرتا تھا۔ لیکن جب کام ہی نہ ملتا تو مجبوری ہوتی۔ بیکار کا وقت کاٹنا ابا کے لئے بڑا مشکل ہوتا تھا۔ مشکل ہوتا بھی کیوں نہ گھر میں آٹھ نو کھانے والے تھے۔ سوکھی روٹی کے لئے بھی تو پیسے چاہئیں ہوتے۔ ابا کا ہر حال میں ساتھ دینے کا اماں نے اپنے آپ کو پابند کر لیا تھا۔ اسی لئے وہ بستی کے پار والی آبادی میں بڑی بڑی کوٹھیوں میں کام کرنے جاتی تھی۔ میں بھی بہت چھوٹی سی عمر میں اماں کے ساتھ کام پر جانے لگی تھی۔ مجھ سے چھوٹی بہن گھر میں رہتی۔ اور بچوں کو سنبھالتی۔

کوٹھیوں میں کام کرتے کرتے ہی میں جوان ہو گئی تھی۔ کپڑے لتے کی ہمیں کوئی کمی نہ تھی۔ بیگمات اور ان کے بچوں کی اترنیں ہمیں مل جایا کرتی تھیں۔ کھانے پینے کو بھی بچا کھچا مل جاتا۔ اور جو کبھی ان کوٹھیوں میں سالگرہیں یا شادیوں کی تقریبات ہوتیں تو ہماری عیش ہو جاتی۔ برتن بھر بھر کر پلاؤ اور زردہ گھر بھی لے آتے۔ جو کئی کئی دن بچے کھاتے اڑاتے رہتے۔ بعض دفعہ تو کھانا اتنا زیادہ ملتا کہ ہم اڑوس پڑوس میں بھی تھالیاں بھر بھر کر بھجواتے اور اس طرح تفاخر سے کہتے "تم بھی کھا لو بہت مزے کا ہے۔" انہیں یوں احساس دلاتے کہ دیکھیں ہمارے ہاں ہی اتری ہیں۔

کوٹھیوں میں کام کرنے کے فائدے بھی تھے۔ کپڑا لتا ہم نے کبھی خود خریدا ہی نہ تھا۔ کبھی چینی کے زخم خوردہ برتن بھی ہمیں دے دیئے جاتے۔ پیالی میں ذرا سا بال آگیا یا کنارہ اکھڑ گیا تو وہ ہمیں بخش دیا جاتا۔ یوں ہمارے گھر رنگ برنگے برتنوں کی بھرمار ہو جاتی۔ اچھے اچھے پیس اماں چھتی پر لگا دیتی۔ باقی عام استعمال کے لئے رکھ دیتی۔ کبھی کبھی تو یہ کاٹھ کباڑ بیچ کر اماں پیسے بھی کھرے کر لیتی۔ فائدے تو تھے۔ لیکن کام کرنا آسان نہیں ہوتا تھا۔ کچھ بیگمات تو اتنی نک چڑھی اور بدمزاج تھیں۔ کہ ڈانٹ ڈپٹ کے سوا کام ہی نہ ہوتا۔ اس لئے تو ہم نے کئی گھر چھوڑے کئی پکڑے۔ کہیں بھی ہم ماں بیٹیوں نے ایک لمبا عرصہ کام نہیں کیا ..... کام کی ہمیں کمی نہ تھی۔ اور کام کرنے والوں کی ان لوگوں کو۔ اس لئے یہ سلسلہ چلتا ہی رہتا تھا۔

www.freepdfpost.blogspot.com

میں کام چور ہرگز نہ تھی..... مجھے ان کوٹھیوں میں کام کرنا اچھا لگتا تھا..... یہ بڑی بڑی جہازی سائز کوٹھیاں سجے سجائے کمرے..... قالین پردے صوفے بیڈ..... چمکتے دمکتے برتن..... پھسلتے فرش..... یہاں فضا ہی اور ہوتی تھی..... میں جب پائپ اور جھاڑو لے کر مدزیک کے فرش دھوتی..... یا ویکیوم کلینر کے ساتھ قالین صاف کرتی تو مزہ ہی آ جاتا۔ کتنی خوبصورت خوبصورت اور نایاب چیزیں ہوتیں جنہیں وہ دیکھتی..... ہاتھ لگاتی اور صاف کرتی..... مجھے ان چیزوں کے نام بھی آ گئے تھے۔

آ تو مجھے بہت کچھ گیا تھا..... ٹی وی' ریڈیو اور وی سی آر پر کام کرتے چلتے پھرتے گانے تقریریں اور فلمیں دیکھ کر میں دنیا سے واقف ہو گئی تھی..... لباس تزئین میک اپ ہر چیز سے آگہی ہو گئی تھی۔ میں تو اب انگریزی کے کئی لفظ بھی بول لیتی تھی اور ان کا مطلب بھی جان لیتی تھی۔ اماں سے زیادہ بیگمیں میرے کام کو پسند کرتی تھیں۔ میرا گھروں میں آنا پسند کرتی تھیں۔ کہ میں تیزی سے صاف ستھرا کام کرنے کے علاوہ ان سے باتیں بھی ڈھنگ سے کر لیتی تھی۔ خاص کر جب ان کے گھروں میں مہمان آتے تو ٹرالی لانے اور چیزیں پیش کرنے کے لئے مجھے ہی بلایا جاتا..... کیونکہ میں اماں سے زیادہ طریقہ سلیقہ جانتی تھی.....

دوسرے

میں صاف ستھری بھی رہتی تھی۔ بیگمات جو اترنیں دیتیں انہیں ٹھیک ٹھاک کر کے پہنتی..... صفائی کے لئے تو بیگمات کی خاص طور پر تلقین ہوتی جو میں بچپن سے سنتی آئی تھی..... جب میں چھوٹی تھی۔ تو وہ اماں کو ہدایت دیتیں۔

"اے برکتے۔ لڑکی کو ساتھ لاتی ہے تو گندی مندی نہ لایا کر....."

"کپڑے تجھے ہم دیتے ہیں۔ تو اسے پہنا نہیں سکتی۔

"کنگھی چوٹی کر کے بال گندھا کر....."

"ناک بہتی رہتی ہے اس کی رومال نہیں تو کوئی کپڑا ہی پکڑا دیا کر....."

"دیکھ برکتے تیری بچی کام اتنا نہیں کرتی جتنا ہمارے بچوں کے ساتھ کھیلتی ہے۔ اسے صاف ستھرا کر کے لایا کر۔ اور ہاں دیکھ اس کے بالوں کو دوسرے تیسرے دن دھو کر تیل لگایا کر..... اور دیکھا بھی کر جوئیں تو نہیں ہیں سر میں..... کہیں ہمیں بھی تحفہ نہ دے دینا یہ.....

رجوں نظر آ گئی نا تو کھڑے کھڑے نکال دوں گی....."

اماں بیچاری کام کی مجبوری کی وجہ سے میرا بہت خیال رکھتی..... جب بھی وقت ملتا مجھے لے بیٹھتی اور میرا سر دیکھا کرتیں.....

میں جب بڑی ہو گئی تو یہ خیال خود ہی رکھنے لگی..... کپڑے بنا سنوار لیتی۔ دھو دھلا بھی دو ہی لیتی۔ کوٹھیوں کے نوکر گھروں کے غسلخانوں میں نہا دھو بھی لیا کرتی..... پاؤں سے ننگے بھی نہ پھرا کرتی اور بیگموں کے دیئے ہوئے ہیل والے سینڈل پہن کر بھی مجھے چلنا پھرنا آ گیا تھا۔

ہم ماں بیٹی دو دو تین تین کوٹھیوں میں بیک وقت کام کرتیں۔

اماں برتن دھوتی

تو

میں صفائی کر لیتی۔

کہیں اماں کپڑے دھوتی تو میں کچن صاف کر لیتی۔

اور

کہیں اماں آٹا گوندھتی سبزی بناتی تو میں فٹافٹ کپڑے استری کر کے ہینگروں میں ڈال الماریوں میں ٹانگ دیتی۔

یوں اکثر ہم لوگ دو تین بجے تک فارغ ہو کر اپنے گھروں کو لوٹ آتے۔ واپسی پر ہمارے ہاتھوں میں کبھی بچی کھچی روٹیاں ہوتیں..... ٹوسٹوں کے ٹکڑے ہوتے..... بار بار گرم کئے ہوئے سالن ہوتے..... ہم یہ سب چیزیں مومی لفافوں میں ڈال کر لے آتیں..... کبھی کبھی گتے کے ڈبے اٹھائے ہوتے جن میں پرانے کپڑے' ردی اخبار' خالی بوتلیں اور ٹین ہوتے..... جنہیں مخیر بیگمات ہمیں دے دیتیں..... تاکہ ہم بیچ کر کچھ پیسے بنا لیں..... یہ عام بیگمات کا دستور نہیں تھا..... کوئی کوئی بخیر بیگم ایسا کرتی۔

ہمیں پیسے ملتے تھے چیزیں ملتی تھیں..... ابا بھی دہاڑی لگاتا تھا..... پھر بھی خوشحالی نام کی کوئی شے ہم نے نہ دیکھی تھی۔ اس کی وجہ بچوں کی فوج ظفر موج تھی۔ ہم سات بہن بھائی تو ہو چکے تھے۔ اور ابھی بھی اماں بچوں کی طرف سے ناامید نہ تھی..... اسکی گود میں چھ ماہ کی

www.freepdfpost.blogspot.com

جینا تھی۔ اور وہ اس کا دودھ چھڑانے کی فکر میں تھی۔ کہ شاید پھر سے امید ہو رہی تھی۔

میں جوان ہو گئی تھی۔

اور

اماں ابا میری شادی کرنے کے چکر میں تھے۔ میرا رشتہ انہوں نے اپنے دور پار کے عزیزان میں جانے کب سے طے کر دیا تھا۔ خیرو پنکھوں کے کسی کارخانے میں مزدوری کرتا تھا۔ اور اس کا ابا بھی سوڈے کی فیکٹری میں جاتا تھا۔ ماں اور بہن بھی کسی کوٹھی میں کام کرتی تھیں۔ چونکہ ان کا کنبہ مختصر تھا۔ اس لئے مالی حالت ہم سے اچھی تھی۔ ان کے پاس دو کوٹھڑیوں کا گھر تھا؛ صحن بھی پکا تھا..... اور قلعی چونا بھی گھر میں کرتے رہتے تھے۔ خیرو کے پاس چھوٹا سا ٹرانسسٹر بھی تھا۔ اور وہ اچھے کپڑے پہننے کا بھی شوقین تھا۔

ایسا رشتہ میری خوش بختی کی دلیل تھا۔ میری چاچیاں اکثر چرچے کرتیں۔

"بڑی بھاگوان ہے قیو....."

"اتنے اچھے گھر میں جائے گی۔"

"کنبہ بھی چھوٹا سا ہے۔ وہ بیٹی کو بیاہ دیں گے تو راج بھاگ اسی کا ہو گا۔"

"قیو کی اپنی تقدیر....."

"وہاں تو نوکری وو کری نہیں کرنے دیں گے اسے..... ماں نے تو ساری عمر ہی نوکری کروائی۔"

"ویسے ہے اچھی بات..... تمیزدار ہو گئی ہے اچھے گھروں میں جانے سے۔"

"اوڑھنا پہننا بھی آ گیا ہے۔"

"ہانڈی روٹی بھی اچھی پکا لیتی ہے۔ اس دن کیا پتلے پتلے پھلکے ڈال رہی تھی....."

"پلاؤ تو بڑا ہی اچھا بناتی ہے۔"

"اے چل..... غریبوں کے ہاں کونسا روز پلاؤ زردے پکتے ہیں۔ یہ ہی اچھی بات ہے۔ کہ ہاتھ سیدھے ہو گئے۔ گھر گرہستی سنبھال لے گی۔

"واقعی..... ویسے ایک بات ہے..... قیو بگڑی نہیں..... نہ ہی دماغ میں فتور آیا ہے۔ اس راجو کی طرح....."

"ہاں شیدو کو بھی دیکھو نا..... ہماری قیو ان کی طرح نہیں نکلی..... وہ تو کوٹھیوں میں جا جا کے اپنے آپکو کوٹھیوں والیاں ہی سمجھنے لگی ہیں....."

اور

واقعی

میرا نہ دماغ بگڑا تھا۔ نہ میں اپنے آپکو کوٹھی والی سمجھنے لگی تھی۔ میں جو تھی وہی تھی۔ کام سے فارغ ہو کر گھر آتی تو اپنے ہی ماحول میں رنگ جاتی۔ گندے مندے بہن بھائیوں کو پیار کرتی اور ٹوٹی پھوٹی کوٹھڑی میں بیٹھ کر پرانے کپڑے ٹھیک کرتی رہتی۔ شیدو کیطرح نہ تو میں اپنے بہن بھائیوں کو ٹھڈوں سے اڑاتی۔ نہ ہی اترنیں پہن کر اپنے آپ کو حور پری تصور کرتی..... نہ ہی اپنے گھریلو ماحول کو دیکھ کر ناک منہ چڑھائی۔

شیدو کی ان حرکات سے بغاوت کی بو بھی آتی تھی۔ اور مجھے تو لگتا تھا۔ کہ وہ اس ماحول سے فرار ہو جائے گی۔ سننے میں یہ بھی آیا تھا۔ کہ وہ رات کے وقت کسی سکوٹر والے کے پیچھے بیٹھ کر کہیں جاتی ہے۔ میری طرح کی دو چار اور لڑکیاں بھی تھیں۔ جو کوٹھیوں میں کام کر کر کے اپنے مقام کو بھلا بیٹھی تھیں۔ جیرو کو کوئی فلم میں کام دلانے کا جھانسہ دے کر بھگا لے گیا تھا۔ سلیمہ اڑنے کو پر تول رہی تھی اور سلطان بانو نے مزدور سے شادی کرنے سے انکار کر دیا تھا۔

ان لڑکیوں کے تیور دیکھ کر بستی کے وہ لوگ جن کے ہاں جوان ہوتی لڑکیاں تھیں ڈر گئے تھے۔ اس لئے چودہ پندرہ سال کی ہوتے ہی ان کی شادیاں کرنے کی سوچتے تھے۔ اور شاید اسی لئے جیسا رشتہ بھی ملتا سر منڈھ دیتے.....

شادی کی تیاری میری اماں بھی کر رہی تھی۔ اور ابا بھی پیسے جوڑ رہا تھا۔ گو انہیں میری طرف سے کسی قسم کا خدشہ نہیں تھا۔ پھر بھی۔ رشتہ طے جو کر دیا تھا۔ اس لئے شادی کرنا ہی تھی۔

آج بھی ابا کچھ پیسے لایا تھا۔

اور

اب چارپائی پر ہتھی پالتی مارے بیٹھا اماں سے حساب کتاب لے رہا تھا۔ اماں نے پیسے

www.freepdfpost.blogspot.com

جمع کر کے ریکسین کے سوٹ کیس میں جو کسی کوٹھی سے اسے ملا تھا رکھے تھے۔

"لا بھی کل کتنے ہوئے ہیں۔" ابا نے اماں سے کہا۔ "میں تو ایک سو بیس روپے ابھی لایا ہوں۔"

میں کواڑ کے باہر کھڑی تھی..... اماں ابا جو جوڑ توڑ کر رہے تھے چپ چاپ سنے جا رہی تھی۔

اماں پوٹلی نکال لائی اور ابا کے سامنے رکھتے ہوئے بولی۔ "ابھی تو بہت کم ہیں۔ کیا بنے گا۔"

"بن ہی جائے گا۔ گن تو سہی۔"

اماں ادوائن کی طرف بیٹھ گئی..... ابا نے پوٹلی کھولی اور دونوں تڑے مڑے نوٹ گننے لگے۔ ان میں صرف ایک لال نوٹ تھا..... باقی دس پانچ اور روپے دو روپے کے نوٹ تھے۔ کچھ ریزگاری بھی تھی.....

"یہ تو پانچ سو بھی نہیں....." ابا گہری سانس لیکر بولا۔

"ہاں..... میرا بھی یہی خیال ہے۔" اماں نے میلی چادر سے آنکھیں صاف کیں۔

"اتنے پیسوں سے کیا بنے گا۔"

"کچھ ہو ہی جائے گا۔ تین کوٹھیوں کی بیگموں نے قیو کی شادی پر پیسے دینے کا وعدہ کیا ہے۔ باجی شائستہ نے تو دو ریشمی نئے جوڑے بھی دیئے ہیں....."

"جوڑے کتنے ہوئے ہیں؟"

"پانچ اور اتنے ہی کافی ہیں۔ برتن بھی کچھ بن گئے ہیں..... کھیس بھی تین بنوا لئے ہیں اور ایک رضائی بھی کوٹھی والی نے دینے کا وعدہ کیا ہے....."

"ہوں..... کچھ نہ کچھ کر لیں گے..... مجھے تو صرف روئی کا بندوبست کرنا ہے..... نمکین اور میٹھے چاولوں کی ایک ایک دیگ تو اترے گی....."

"وہ تو ہے..... پر....." اماں کچھ کہتے ہوئے ہچکچائی۔

تو

ابا بولا۔ "کیا؟....."

"باقی چیزیں....."

"باقی کیا؟ دو چارپائیاں میرے دونوں بھائی لائیں گے۔ رنگین پایوں والی....."

"ہونھ....."

"کیوں؟"

"تمہاری لاڈو تو..... کہتی ہے۔"

"کیا کہتی ہے۔"

"کہتی ہے فوم کے گدے والا بیڈ لوں گی..... چارپائیاں نہیں لینا مجھے....."

"کیا؟....." ابا نے اتنا لمبا کیا کہا کہ میں کچھ ڈر سی گئی.....

اماں ہنس پڑی..... اور تمسخر سے بولی۔ "کہتی ہے اور کچھ بھی نہ دو مجھے۔ صرف فوم کے گدے والا بیڈ لے دو....."

"پاگل تو نہیں ہو گئی وہ....."

"میں کیا کہوں..... جب بھی جہیز کا نام لیتی ہوں۔ یہی ضد ہوتی ہے اس کی....."

"لگتا ہے کوٹھیوں میں جا جا کے اس کا دماغ بھی پھر گیا ہے۔ فوم کا بیڈ پتا بھی ہے کتنے کا آتا ہے۔"

"لو بھلا میں کوئی اس کی بات سنجیدگی سے سنتی ہوں..... وہ کہتی ہے کہتی رہے....."

"حد ہو گئی....." ابا سر ادھر ادھر ہلاتے ہوئے ہنسا۔ یوں جیسے اپنے اوپر تمسخر سے پھبتی کسی ہو۔ مزدور کی بیٹی اور خواہش دیکھو..... بر کتے اسے سمجھایا کر..... وہ کسی مالدار باپ کی بیٹی نہیں..... نہ ہی کوٹھیوں اور پکے مکانوں میں رہنے والی ہے۔ یہ باتیں انہی لوگوں کو سجتی ہیں۔ ہمیں تو چارپائیاں بھی نصیب ہو جائیں تو بڑی بات ہے۔"

ابا الجھ الجھ کر اماں کے سامنے تقریر کرنے لگا۔

"اب بس بھی کر....." اماں اکتا کر بولی۔ "بچی ہے' اگر خواہش کا اظہار کر بھی دیا تو کونسا کرنے پر مجبور ہیں..... جب ہماری حیثیت ہی نہیں تو پھر اس دھواں دھار تقریر کی کیا ضرورت؟"

"مجھے حیرانی ہوئی ہے۔"

www.freepdfpost.blogspot.com

"خیر چھڑو..... حیرانی کی تو کوئی بات نہیں..... فوم کے گدے والا بیڈ اسے اچھا لگتا ہو گا۔ سو کہہ دیا۔ لے کر ہم نے دینا ہے..... اور ہم جانتے ہیں کہ بھائی رنگین پایوں والی چارپائیاں دینے کا وعدہ نہ کرتے تو ہمارے پاس کھری چارپائیوں کے لئے بھی پیسے نہ تھے..... وہ تو بھلا ہو ان بیگموں کا جنہوں نے شادی کا خرچہ دینے کا وعدہ کیا ہے اور....."

ابا جلدی سے اماں کی بات کاٹتے ہوئے تجسس سے بولا۔ "کتنا کتنا دیں گی؟"

"پتہ نہیں..... ایک بیگم صاحب نے تو کہا تھا دو ہزار روپیہ....."

"دو ہزار؟" ابا نے بے صبری سے اماں کی بات کاٹی۔

"اور کیا دو سو۔" اماں اترائی۔ "عمر بیت گئی ان لوگوں کی خدمت کرتے..... اب بھلا اسوقت ہمارا ہاتھ نہ پکڑیں۔"

پھر تو سارے کام سنور جائیں گے۔"

سعدیہ بھی لگ بھگ اتنا ہی دیں گی..... وہ باجی سعدیہ جنہوں نے جب تمہاری ٹانگ کا زخم ٹھیک نہیں ہوتا تھا تو پانچ سو روپے دیئے تھے۔ یاد ہے نا؟"

"ہاں..... اللہ بھلا کرے ان لوگوں کا..... خدا کے بعد ہمیں انہی کا تو آسرا ہے۔ واہ برکتے تم نے تو میرے سر سے بوجھ ہی اتار دیا....."

"کپڑے لتے بھی اور ملیں گے؟"

"اچھا..... اسی لئے تو میں کہوں یہ برکتے خوشی خوشی تیاریوں میں کیسے لگی ہے....."

"پہلی بیٹی کی شادی ہے..... خوشی تو ہے ہی..... اور پتہ ہے؟"

"کیا؟"

اماں نے سرگوشی کے لہجے میں کہا۔ "یہ اپنی قیو ہے نا....."

"ہاں....."

"اسے بھی پتا ہے کہ باجی سعدیہ اور وہ بڑی بیگم صاحب اتنی بڑی بڑی رقم دے رہی ہیں شادی کے لئے۔

"ہوں..... اسی لئے دماغ خراب کر رہی ہے اپنا..... ہونہہ..... فوم کے گدے والا بیڈ....."

"اے ہے بچی ہے..... تم پھر تقریر نہ کرنے لگنا..... خواہش ہی کی ہے نا اس نے..... سر تھوڑا ہی پھاڑے گی۔"

اور

میں

میں

تو اس کی خواہش کے پورا کرنے کے لئے سر پھاڑنے کو بھی تیار تھی۔

اماں اور ابا باتیں کرتے رہے اور میں چھپڑ تلے پڑی چارپائی پر بیٹھ گئی.....

فوم کے گدے والا بیڈ میری خواہش ہی نہیں کمزوری تھی..... ضرورت تھی..... ضد تھی..... میں نہیں جانتی تھی کہ یہ بیڈ کتنے میں آئے گا۔ اور اک مزدور کی بیٹی کے جہیز میں ایسی چیز ہونی چاہئے یا نہیں

لیکن

میں اتنا جانتی تھی کہ فوم کے گدے والا بیڈ مجھے نہ ملا۔ تو میں شادی ہی نہیں کروں گی....."

چنانچہ

اس دن بھی جب ابا خوش خوش مونچھوں پر ہاتھ پھیرتے باہر چلا گیا اور اماں بھی کوٹھری سے باہر نکلی

تو

میں نے

بے دھڑک کہا "اماں..... میں فوم کے گدے والا بیڈ ضرور لوں گی....."

"پگلی" اماں میرے قریب ہی کھڑی چارپائی کی پٹی پر بیٹھ گئی.....

"مت کہہ پگلی۔" میں غصہ میں بھر گئی..... "میں نے تجھے کہہ دیا ہے کہ رنگین چارپائیاں نہیں لینا مجھے..... کچھ بھی نہ دے۔ کپڑے بھی خود رکھ لے۔ بستر بھی نہ دے۔ لیکن فوم کے گدے والا بیڈ ضرور لے کر دے۔"

"پتہ ہے کتنے کا آتا ہے۔"

www.freepdfpost.blogspot.com

"جتنے کا بھی آئے....."

"تیرے باوا کے پاس خزانہ دھرا ہے نا۔" اماں بھی تنک کر بولی۔

"ادھر ادھر جو یونہی خرچ کرو گی وہ نہ کرنا نا....." میں بھی غرائی

"بڑی ٹھیکے دار کی بیٹی ہے نا تو..... کوٹھیوں میں رہتی ہے کاروں میں گھومتی ہے۔ جو تجھے فوم کا بیڈ چاہئے....."

"جو کچھ بھی ہوں..... لیکن لوں گی فوم کا بیڈ..... جان لے..... نہ لے کر دیا۔ تو شادی بھی نہیں کروں گی۔ کوئی شوق نہیں ہے مجھے شادی کا....."

"فوم کے گدے والے بیڈ کا شوق ہے تجھے....."

"ہاں ہے....."

"تو پھر بیٹھی رہ..... نہ کر شادی....."

"نہ کر..... بے شک نہ کر..... میں نے کہا ہے نا کہ مجھے شادی کا کوئی شوق نہیں....."

میں بھی غصے سے غرانے لگی تو اماں نرم پڑتے ہوئے بولی۔ "بیٹی..... اتنے پیسے کہاں سے لاؤں گی۔"

"جہاں سے مرضی ہے لا..... میں تنک کر بولی۔" ساری عمر میں نے بھی مزدوری کی ہے رلتی رہی ہوں بچپن سے اب تک تیرے ساتھ کوٹھی کو بھی..... اتنا بھی نہیں ہے اب کہ میری یہ خواہش پوری کر سکو....."

"خواہش؟ ہونہہ۔" اماں روہانسی ہو کر بولی۔ "غریبوں کو خواہش کرنے کا حق نہیں ہوتا۔"

"ہوتا ہے یا نہیں میں نہیں جانتی۔ لیکن یہ جانتی ہوں۔ کہ میری خواہش تم نے پوری نہ کی۔ تو میں..... میں....."

میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اماں کا دل اور پسیج گیا اور مجھے ایسی خواہش سے روکنے کی کوشش میں بہلانے پھسلانے لگی۔ جسے پورا کرنا وہ اپنے بس اور امکان میں نہیں سمجھتی تھی۔

لیکن

میرا اصرار

میری ضد

میری خواہش

اسی نہ تھی جو بہلاووں میں آ جاتی..... میں نے دو ٹوک اماں سے کہہ دیا....." بیڈ لے کر نہیں دے سکتی نا۔ تو شادی بھی نہ کر۔ کر دے سیو کی شادی خیرو سے....." میں نے روتے ہوئے غراتے ہوئے غصے سے پھنکارتے ہوئے چھوٹی بہن کا نام لے دیا....."

"تیرا تو دماغ الٹ گیا ہے۔" اماں سمجھ نہ پا رہی تھی کہ کیا کرے مجھے اکیلا چھوڑ کر وہاں سے چلی گئی.....

اور

میں

میں

اپنی خواہش کے آگے بے بس ہوتی وہیں بیٹھی رہی۔ خواہش پیدا ہوتی ہیں اور ضروری نہیں کہ پوری بھی ہوں۔ ہوتی ہیں اور مر جاتی ہیں۔ لیکن جب یہ خواہشیں اتنی تنومند ایسی زوردار ہو جائیں..... کہ وجود کے اندر ان کا اپنا مضبوط اور مستحکم وجود بن جائے۔ تب وہ مرتی نہیں پاتیں..... بلکہ اس وجود کو ختم کر ڈالتی ہیں جس کے اندر وہ جنم لیتی ہیں۔

میرا بھی کچھ یہی حال تھا۔

میری یہ خواہش

بچپن سے میرے اندر پل رہی تھی۔ اب تو اس کا وجود میرے وجود سے بھی زیادہ بڑھ پھیل گیا تھا۔ اور میں کسی طور اس سے الگ نہ ہو پاتی تھی۔ مجھے پتہ تھا میرے ماں باپ کی اتنی استطاعت نہیں یہ بھی جانتی تھی۔ کہ اک مزدوری کو ٹھی کو ٹھی کام کرنے والی بیٹی کے جہیز میں فوم کا بیڈ اک انہونی شے ہو گی..... لوگ تعریف کرنے کی بجائے تمسخر اڑائیں گے۔

لیکن

میں کیا کرتی..... میں تو اپنے آپ کو اب اس خواہش کا ایک حصہ سمجھنے لگی تھی۔ اس خواہش نے مجھ سمیت میری ساری کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ اس سے دستبردار ہونا

www.freepdfpost.blogspot.com

میرے بس میں نہیں تھا۔ یہ بچپن سے میرے ساتھ تھی۔

یہ

ان دنوں کی بات ہے۔ جب میں اماں کے ساتھ کوٹھیوں میں جایا کرتی تھی۔ کام کاج تو ابھی نہ کر سکتی تھی ہاں اماں ہی کا ہاتھ بٹاتی تھی۔ اماں برتن دھوتی تو میں انہیں اٹھا اٹھا کر جہاں رکھنا ہوتا رکھ دیتی اماں جھاڑو لگاتی تو میں کوڑا اکٹھا کر کے ٹوکری میں ڈال دیتی۔ اماں بچارا لگاتی تو میں بالٹی میں پانی لے آتی۔ اماں کپڑے دھوتی تو میں نچوڑنے میں اس کی مدد کرتی۔

میری عمر ان دنوں آٹھ نو سال ہو گی.....

کوٹھی کو ٹھی کام کرنے سے مجھے تنخواہ تو نہیں ملتی تھی۔ ہاں کپڑے جوتے مل جاتے۔ کبھی کوئی خوبصورت فراک جو پہننے والی کو چھوٹا ہو گیا ہوتا۔ کبھی ایسا جوڑا جو مالکوں کے بچے کے استعمال میں اب نہ آتا پھٹے پرانے جوتے بھی مل جاتے..... جو ہمارے لئے نئے جوتوں سے بھی بڑھ کر ہوتے نئے جوتے یا کپڑے کا تو کوئی تصور ہی نہ تھا۔ ہم لوگوں کی اترنیں ہی استعمال کرنے کے عادی تھے۔ مجھے ایسے کپڑے پہن کر بڑی خوشی ہوتی اور میں بستی کی ان لڑکیوں میں جن کے پاس ایسی اترنیں نہ ہوتی تھیں۔ بڑا اترائی اترائی پھرا کرتی تھی۔

کپڑوں کے علاوہ مجھے کچن میں بچے کھچے ٹوسٹ۔ کبھی کبھی کسی بچے کا چھوڑا ہوا انڈا..... اور پراٹھا بھی کھانے کو مل جاتا.....

میرا کوئی خاص کام تو ہوتا نہیں تھا۔ اس لئے اماں کے ساتھ جس کوٹھی میں بھی جاتی زیادہ تر کھیلتی ہی رہتی..... میری عمروں کے بچے تو سکول چلے جاتے ہاں کسی گھر میں چھوٹے چھوٹے بچے ہوتے تو میں ان کے ساتھ کھیلتی۔ ان کے کھلونوں کے ساتھ کھیلتی..... اکثر بیگمات ناک منہ چڑھاتیں کھلونے مجھ سے چھین لیتی۔

لیکن

جن کے بچے اتنے ہوتے کہ میں انہیں اٹھا کر اندر باہر کھلائے پھرتی۔ وہ اپنے بچے بخوشی میری کمر پر لاد دیتیں..... جتنا وقت اماں کام کرتی وہ بچے مجھے تھما کر اپنا دوسرا کام کر لیتیں۔ کبھی کبھی کوئی بیگم اس مزدوری کا صلہ مجھے ٹافی بسکٹ یا ایک آدھ روپیہ دے کر بھی چکا دیتی۔

اماں مجھے ساتھ تولاتی تھی۔

لیکن

سارا رستہ سمجھاتی آئی۔

"چیزیں نہ چھیڑنا۔"

"کوئی شے چرانا نہیں....."

"کھانے کی چیزوں کی طرف خود کبھی ہاتھ نہ بڑھانا....."

"کوئی شے ادھر ادھر نہ کرنا....."

"کھلونے بڑے قیمتی ہوتے ہیں۔ توڑ پھوڑ نہ دینا....."

"بچوں کو احتیاط سے اٹھایا کرو..... کسی کو کہیں گرا نہ دینا....."

میں اماں کی باتیں سنتی..... اور جتنی سمجھ اس عمر میں تھی اتنا ہی سمجھتی۔

انہی دنوں

ایک کوٹھی میں جہاں ہم ماں بیٹی جایا کرتی تھیں شادی ہوئی۔ اتنی دھوم دھام اتنا ہلا گلا۔ اتنا شور شرابہ بس کئی دن ہنگامہ بپا رہا۔

پھر

دلہن بیاہ کر آ گئی..... اس کا کمرہ بڑی خوبصورتی سجایا گیا۔ قالین پردے صوفے آرائشی چیزیں الماریاں

سنگار میز

اور

اور

فوم کے گدے والا خوبصورت بیڈ۔

جانے کیوں

مجھے سارے کمرے میں وہ فوم کا گدے دار بیڈ ہی اچھا لگتا۔ اس کمرے کی صفائی اماں کے سپرد تھی۔ اور اماں کو بڑی بیگم نے ہدایت دی تھی۔

"کمرے میں نازک چیزیں بھی ہیں۔ ذرا احتیاط سے کام کیا کرو..... سنگار میز پر جو

www.freepdfpost.blogspot.com

شیشیاں ڈبیاں ہیں نا..... سینکڑوں روپوں کی ہیں..... کہیں کوئی گرا نہ دینا..... ایک چیز بھی ٹوٹ گئی..... تو یاد رکھنا بھر نہیں پاؤ گی....."

واقعی کمرے میں بے شمار نازک نازک کانچ اور کرسٹل کی چیزیں تھیں..... سنگار میز پر بھی میک اپ کا سامان ہوتا تھا..... اماں کوشش کرتی کہ جب وہ کمرے میں صفائی کے لئے جائے تو میں باہر ہی رہوں۔

لیکن

میں تو اماں سے پہلے اس کمرے میں گھس آتی۔ نرم نرم فوم کے گدے والا بیڈ میرے لئے بلا کی کشش رکھتا تھا۔ کمرے کی آرائشی زیبائشی چیزوں میں مجھے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ میرے لئے تو بیڈ ہی باعث کشش تھا۔ پہلے پہلے تو میں صرف اس کے قریب کھڑی ہو کر ہی اسے دیکھتی..... کبھی دونوں ہاتھوں سے گدے کو دباتی اور اس کی لچک سے محظوظ ہوتی۔ کبھی کہنیاں گدے میں دھنسا کر پٹی کے قریب قالین پر بیٹھ جاتی۔

لیکن

اس لچک سے اس دبنے ابھرنے کی کیفیت سے مجھے اتنا سرور ملتا۔ کہ ایک دن جب اماں قالین صاف کر رہی تھی۔ میں بیڈ پر چڑھ گئی.....

واہ..... وا..... کیا مزہ آیا ہے..... میں بیڈ پر کودنے لگی..... گیند کی طرح اچھلی تو بڑا مزا آتا..... اچھلتی..... اچھلتی اور پھر دھم سے چوکڑی مار کر بیٹھ جاتی۔

"دیکھ اماں۔" میں نے جھاڑو لگاتی اماں کو متوجہ کرتے ہوئے بیڈ پر خوب اونچی جمپ لگائی اور دھم سے بیڈ پر بیٹھ گئی۔

"اے تیرا ستیاناس۔" اماں نے جلدی سے دروازے کی طرف دیکھا کہ کس نے مجھے جمپ لگاتے دیکھ تو نہیں لیا۔ پھر میری طرف لپکی اور مجھے بازو سے پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے بیڈ سے اتار لیا۔

"قیو....." اس نے میری گال پر زور سے چٹکی کاٹی..... "خبردار جو آئندہ تو بیڈ پر چڑھی..... مار ڈالے گی دلمن تجھے..... نگوڑ ماری کود رہی ہے اور اوپر چڑھ کے..... خبردار جو تو پلنگ کے قریب بھی گئی۔"

"میں ڈانٹ ڈپٹ کی پرواہ کئے بغیر بولی۔ "اماں اتنا مزہ آتا ہے۔ دیکھ نا کتنا نرم نرم ہے....." میں پھر بیڈ کی طرف بڑھی۔ تو اماں نے مجھے بالوں سے پکڑ کر اپنی طرف گھسیٹ لیا۔

"تو باز نہیں آئے گی..... بے عزتی کروائے گی میری بیگم سے۔" اماں نے مجھے دھکا دے کر کمرے سے باہر نکال دیا.....

میں بسورنے لگی۔ اور للچائی للچائی نظروں سے بیڈ دیکھنے لگی۔

یہ

تقریباً روز ہی کا معمول بن گیا۔ اماں غصے سے غراتی رہتی۔ مجھے گندی گندی گالیاں دیتی کمر میں اتنا زبردست دو ہتڑ لگاتی کہ میری ہڈیاں ہل جاتیں۔ بال پکڑ کر گھسیٹتی تو میں درد سے بلبلا اٹھتی۔

اماں مجھے پیار سے بھی سمجھاتی۔ گھر آکر ابا سے بھی پٹواتی۔ اور پھر مجھے دھمکی بھی دیتی کہ آئندہ مجھے کام پر ساتھ نہیں لے جایا کرے گی۔

لیکن

کام پر ساتھ لے جانا اماں کی ضرورت تھی۔ میں اماں کے کئی چھوٹے موٹے کام جو کیا کرتی تھی اماں اس طرح کام کاج سے کچھ جلدی فارغ ہو جایا کرتی تھی۔

اس دن بھی اماں سارا راستہ وعظ و نصیحت کرتی رہی۔ میں تیز قدموں سے چل رہی تھی۔ مجھے کوٹھی پہنچنے کی اماں سے بھی جلدی تھی۔ بیڈ کو دیکھنے چھونے اور اس پر دھما دھم کودنے کی خواہش میرے دل میں روز بروز بڑھتی جو جا رہی تھی..... اماں شاید زیادہ سختی نہ کرتی مجھے مارتی پیٹتی نہیں تو میں بیڈ سے دلچسپی آہستہ آہستہ ختم بھی کر دیتی۔

لیکن

یہ سختی کا نتیجہ تھا

یا

میرے اندر خواہش نے ہی اتنی مستحکم اور مضبوط جگہ لے لی تھی۔ کہ میں بیڈ کو دیکھنے چھونے اور اس پر لیٹنے کے لئے بے چین ہو جاتی۔ رات جب بھی آنکھ کھلتی اور کھردری چارپائی پر کروٹیں بدلتی تو مجھے صبح کا سرور آمیز خیال آجاتا..... صبح جب میں بیڈ کو چھو سکوں

www.freepdfpost.blogspot.com

گی..... دیکھ سکوں گی اور اماں اور گھر والوں کی نظر بچا کر اس پر چڑھ کر دو ایک جمپیں بھی لگا سکوں گی۔

میں اماں کی ڈانٹ ڈپٹ اور پٹائی کے باوجود اپنے شوق کی تسکین ہر روز ہی کر لیا کرتی تھی۔ اماں باہر صفائی کر رہی ہوتی یا کچن میں معروف ہوتی تو میں جھٹ سے بھاگ جاتی۔ دلہن کمرے میں ہوتی تو اس کے باہر نکلنے کے انتظار میں دروازے کے ساتھ لگ کر کھڑی ہو جاتی۔ اور جو وہ باتھ روم میں گئی ہوتی تو اندر لپک جھپک جا کر بیڈ پر چڑھ کر اپنا شوق پورا کر لیتی۔

اس دن بھی میں دلہن کے کمرے میں جا گھسی۔

کمرے میں کوئی نہ تھا۔

ہاں باتھ روم سے پانی گرنے کی آواز آ رہی تھی۔ دلہن بیگم باتھ روم میں تھی۔ میں جھٹ سے بیڈ پر چڑھی۔ اور ہاتھ پسپار کر نرم نرم تکیے میں اپنے میلے کچیلے بالوں والا سر گھسا کر یوں لیٹ گئی..... جیسے کوئی شہزادی پریوں کے کھٹولے پر.....

میں کبھی ادھر کروٹ بدلتی

کبھی ادھر۔

تکیے اٹھا کر سر کے نیچے جماتی اور کبھی سر تکیوں تلے چھپا لیتی

دو ایک بار اٹھ کر کودی بھی

لیکن

آج کودنے سے زیادہ مزہ اس پر اس طرح آسائش سے لیٹنے میں آ رہا تھا۔ میں نے خوب مزہ لیا.....

اور اسی مزے میں جانے کب اور کیسے مجھے بڑی پیاری اور گہری نیند نے آلیا۔

میں سو گئی

اور

پریوں کی شہزادی بن کر سپنوں کے سنہرے دیش میں اڑنے لگی۔ سنہرے سنہرے اڑن کھٹولے پر.....

لیکن

مجھے ایک دم ہی دھچکا سا لگا.....

اڑن کھٹولا پہلے ڈولا پھر الٹ گیا اور میں فضاؤں میں چکراتی زمین سے آ ٹکرائی۔

میں نے جب پوری طرح آنکھیں کھولیں..... تو میرے بال دلہن کی مٹھی میں تھے اور وہ غصے سے پھنکارتی مجھے جھٹکے دیتی بیڈ سے نیچے پٹخ رہی تھی۔

اس نے اتنا شور مچایا تھا کہ بڑی بیگم چھوٹی آیا اور دوسرے نوکروں سمیت اماں بھی کمرے میں آ گئے تھے.....

اک ملازم کی میلی کچیلی دو ٹکے کی بیٹی کی یہ جسارت کہ وہ دلہن کے بیڈ پر چڑھ کر سوئے۔ جیسے ناقابل معافی تھی.....

دلہن نے تو بیڈ کور تکیے اور چادر نوچ کر پرے پھینک دی تھی۔ یوں جیسے وہ سب چیزیں ناپاک ہو گئی ہوں۔

دلہن کے ہاتھوں سے اماں نے مجھے جھپٹ لیا اور کس کس کے وہ دھموکے لگائے۔ کہ میں دوہری ہو ہو گئی.....

پہلے تو دلہن بڑی بیگم اور چھوٹی آپا میرے پٹنے کا تماشہ کرتی رہیں۔ مجھے کوستی رہیں۔ پھر چھوٹی آپا نے اماں سے مجھے چھڑا لیا.....

"قیو..... کیوں چڑھی تھی تو بھابی کے بیڈ پر..... دیکھ تو تیرے کپڑے کتنے میلے ہیں۔ بالوں میں میل بھرا ہے..... بھابی کا سارا بستر تو نے گندہ کر دیا....."

میں روتے روتے بولی۔ "چھوٹی آپا صاف کپڑے پہن کر آؤں تو پھر چڑھ جاؤں پلنگ پر۔" میری معصومیت نے دلہن کا پارہ قدرے نیچا کر دیا..... لیکن وہ چم کر بولا "ہرگز نہیں..... خبردار جو تم بیڈ کے قریب بھی آئیں....."

"کیوں؟" میں نے گندی گندی مٹھیاں اپنی روتی آنکھوں میں گھساتے ہوئے کہا۔

اماں مجھے مارنے کو لپکی۔

لیکن چھوٹی آپا نے مسکراتے ہوئے مجھے اپنے دائیں ہاتھ کر لیا اور قدرے ملامت سے بولی۔ "قیو یہ تمہارا بیڈ نہیں ہے دلہن کا ہے۔ اس پر دلہن سوتی ہے....."

www.freepdfpost.blogspot.com

میں چھوٹی آپا سے ہاتھ چھڑا کر دلہن کے سامنے آتے ہوئے تنک کر بولی۔ "میری شادی ہو گی تو میں بھی ایسے پلنگ پر سوؤں گی..... اور تمہیں ہاتھ بھی لگانے نہ دوں گی....."

"میری بات پر اماں سٹپٹا گئی..... لیکن سب نے قہقہہ لگایا..... دلہن کا قہقہہ اتنا تمسخرانہ تھا..... کہ میں پیچ و تاب کھا گئی..... وہ ہنستے ہنستے بے حال ہو رہی تھی اور کہہ رہی تھی۔

"جا..... جا میرے بیڈ کی خلاصی کر..... اپنے فوم کے گدے والے بیڈ پر ہی سونا۔ دلہن بن کر....."

اس نے پھر استہزائیہ قہقہہ لگایا اور طنز سے بھرپور نگاہ مجھ پر ڈالی۔ میرے اندر قیامت کی ہلچل مچ گئی..... اس چھوٹی سی عمر میں جانے میں اندر سے کتنی مجروح ہوئی..... کہ بیڈ کی طلب میرے اندر بس گئی۔

اس دن کے بعد

میں دلہن کے بیڈ کیا کمرے کے نزدیک بھی نہیں گئی.....

لیکن

فوم کے گدے والا بیڈ میرے ذہن میں تھا..... چپک گیا تھا..... اس کی لچک مجھے گدگداتی تھی..... اس پر سو کر جو میں نے نیند کا لطف لیا تھا..... وہ لطف میرے ذہن میں محفوظ ہو گیا تھا..... میں نے اپنے آپ سے سمجھوتہ کر لیا تھا۔ اپنے آپ کو سمجھا لیا تھا..... کہ فوم کے گدے دار بیڈ پر دلہن ہی سوتی ہے۔

دلہن

اور

بیڈ

میرے ذہن میں لازم و ملزوم کی حیثیت اختیار کر گئے تھے۔

میں بڑی ہوتی گئی۔

اور

میرے اندر بیڈ کی محفوظ طلب اور خواہش بھی تنومند ہوتی گئی.....

میں جوان ہو گئی تھی خاصی سمجھدار بھی تھی..... اونچ نیچ کو بھی سمجھتی تھی..... اپنے

حالات سے بھی آگاہی تھی۔ یہ بھی جانتی تھی کہ غریب ماں اور مزدور باپ کی بیٹی کی سوچوں کی اڑان کتنی اور کہاں تک ہونی چاہئے.....

اور

یہ بھی احساس تھا۔

کہ غریبوں کی کوٹھڑیوں میں فوم کے گدے دار بیڈ سما ہی نہیں سکتے..... کالی کالی دھواں کھائی چھتوں تلے فوم کے بیڈ رکھنے کا کوئی تصور ہی نہیں.....

لیکن

میں کیا کرتی..... میرے اندر یہ احساس جاگزیں ہو گیا تھا۔ کہ دلہن فوم کے بیڈ کے بغیر کچھ ہے ہی نہیں۔ زندگی کے بڑے سال میں نے اس آرزو کی لگن میں کاٹے تھے۔ اور اب مجھے یوں لگتا تھا۔ کہ فوم کا بیڈ مجھے اماں ابا نے لے کر نہ دیا۔ تو میں شادی ہی نہ کر سکوں گی۔ دلہن ہی نہیں بن پاؤں گی.....

بچپن میں جس طرح اماں کی ڈانٹ ڈپٹ سن کر اور پٹائی کروا کر بھی میں بیڈ پر چڑھ جایا کرتی تھی دو ایک جھپیں نظر بچا کر لگا ہی لیا کرتی تھی۔

اسی طرح

اب بھی میں اپنی بات منوانے پر تلی ہوئی تھی۔ مجھے اماں کی پھٹکار کی پرواہ تھی۔ نہ پیار دلاسے سے غریبی کا مسئلہ سمجھانے کی۔

میں تو بس یہی ضد کئے جا رہی تھی۔ "اور کچھ نہ دو..... صرف فوم کے گدے والا بیڈ لے دو....."

اماں مجھے سمجھاتے سمجھاتے عاجز آ گئی۔ وہ اکثر اپنی بے بسی پر رو پڑتی..... ٹھنڈی ٹھنڈی آہیں بھرتی غریبی کا رونا روتے روتے خود بھی بے حال سی ہو جاتی۔

لیکن

میں ٹس سے مس نہ ہوتی..... میرا تقاضا میری ضد اور میری خواہش رد نہ ہو سکتی تھی۔ بلکہ میں تو اماں کے لسوے بہانے پر خاصی بدتمیز ہو جاتی۔ چمک کر تنک کر لڑنے کے انداز میں کہتی۔ "آنسو بہا کر تم مجھے باز نہیں رکھ سکتیں..... ساری عمر میں نے بھی کمائی کی

www.freepdfpost.blogspot.com

ہے۔ کیا دیا ہے تو نے مجھے اس کا صلہ..... کبھی ایک نیا جوڑا بنا کر دیا؟ کبھی نئی جوتی پہننے کو لے کر دی..... میں نے ساری عمر لوگوں کی اترنیں پہنیں..... جھوٹا کھایا خدمت ہی خدمت کی..... ماریں کھا کھا کر جھڑکیں سن سن کر پیسہ کمایا..... اب تم لوگوں سے اتنا بھی نہیں ہو سکتا کہ مجھے میری ضرورت کی ایک چیز ہی خرید دو..... یاد رکھ اماں تو نے بیڈ نہ لے کر دیا تو میں شادی ہی نہیں کروں گی..... عین وقت پر نکاح کے بول پڑھوانے سے انکار کر دوں گی....."

اماں جب خود کچھ نہ کر پائی تو میری سہیلیوں اور چاچیوں کے ذریعے مجھے راہ راست پر لانے کی کوشش کی.....

ان لوگوں کو تو میری اس خواہش پر اتنا اچنبھا ہوا کہ چاچی سکینہ نے گال پر انگلی رکھ کر آنکھیں مٹکائیں اور بولی۔ "فوم کے گدے والا بیڈ.....؟" ہونہہ اس کے ساتھ اور جہیز کیسا بنے گا؟"

دوسری چاچی نے بھی اس بے تکی اور انہونی سی بات کو سن کر حیرانگی کا اظہار کیا۔ یہ بات تو ان کے وہم و تصور سے بھی دور تھی.....

میری سہیلیاں بھی مجھے مذاق میں اڑانے لگیں۔ شیدو کندھے اور بھنوئیں اچکاتے ہوئے بولی۔ "بھئی ہمیں بھی کوٹھیوں میں جاتے برسوں گزر گئے۔ جب سے ہوش سنبھالا ہے ان کوٹھیوں ہی میں کام کر رہے ہیں۔ لیکن تجھ جیسی نامعقول خواہش نہیں پالی ہم نے....."

آسیہ ہمدردی جتاتے ہوئے بولی۔ "بس کر قیو..... خواہش کو کچل ڈال..... کیوں ماسی اور چاچے کے لئے مصیبت کھڑی کر دی ہے۔ اچھی بھلی سیانی ہے تو تو..... سمجھتی کیوں نہیں اپنے گھر کے حالات کو..... بیچاری ماسی برکتے رو رو کر کہتی ہے کہاں سے پوری کروں قیو کی فرمائش....."

"میں کچھ نہیں جانتی..... نہ کرے شادی..... میں کونسا بھاگی جا رہی ہوں۔ نہیں کرنا مجھے شادی وادی..... کہہ دو اماں کو جا کر....."

جب میں کسی طرح سے بھی رام نہ ہو سکی۔ تو اماں ابا نے گویا ہار مان لی۔ کچھ کوٹھیوں سے پیسہ بھی مل گیا تھا۔ باجی شائستہ تو مجھ پر بہت مہربان تھی۔ اس نے معقول رقم دی میری شادی کے لئے..... ایک ریشمی جاپانی کپڑے کا خوبصورت جوڑا بھی بھجوایا..... ارشاد صاحب

کی بیگم نے بھی فراخدلی دکھائی اور پیسے بھجوائے ان کی دیکھا دیکھی اور بھی کئی لوگوں نے اماں کی ساری عمر کی خدمات کے پیش نظر مالی مدد کی.....

اس طرح ان کے ہاتھ میں اب اتنے پیسے آ گئے تھے۔ کہ فوم کا گدے دار بیڈ خریدا جا سکتا تھا..... میری ضد نہ ہوتی تو اس پیسے میں سے اماں میری چھوٹی بہن کے لئے بھی کچھ پس انداز کر سکتی تھی..... یہ نہ سہی تو میرے چھوٹے بھائیوں اور بہن کے لئے نئے کپڑے خرید سکتی تھی کوٹھے اور صحن کا فرش بنوا سکتی تھی۔

لیکن

یہ سب تو جب ممکن تھا۔ جو میں ہتھیار ڈال دیتی۔

بادل نخواستہ اماں اور ابا بستی کے دو ایک سیانے آدمیوں کو لے کر شہر کی فرنیچر کی سستی سے سستی دکانوں کا سراغ نکالنے نکلے..... بہت سوں سے مشورے لئے..... کسی نے کہا کہ پرانا بیڈ خرید کر اس پر رنگ روغن کروا لو.....

کسی نے کہا ہلکی لکڑی کا بنوا لو

کوئی بولا۔ "گدا الگ سے خرید لو۔ اور پلنگ الگ سے بنوا لو..... یوں کچھ سستا پڑے گا۔"

میں نہیں جانتی اماں ابا نے کس کی بات مانی اور کس کے مشورے پر چلے

میں

تو

اس دن جیسے ہواؤں میں اڑ رہی تھی۔

جس دن

فوم کے گدے والا پلنگ ریڑھے سے اتروا کر ابا نے دو اور آدمیوں سے مل کر صحن میں لا ڈالا۔

بیڈ کیا آیا تھا۔ کسی راجے مہاراجے کا سجا سجایا ہاتھی ہمارے آنگن میں آ گیا تھا۔ بستی کے ننگ دھڑنگ بچے پھٹے پرانے لباسوں والی عورتیں اور نامکمل بوسیدہ کپڑوں والے مرد اس بیڈ کو دیکھنے چلے آ رہے تھے.....

www.freepdfpost.blogspot.com

عورتیں آنکھیں مٹکا مٹکا کر کہہ رہی تھیں۔ "برکتے نے تو حد ہی کر دی اور جہیز پتہ نہیں کتنا دے گی۔ سیانی ہے۔ پیسے جوڑ جوڑ کر چیزیں بناتی رہی ہو گی..... ہمیں تو عقل ہی نہ آئی۔ جو آیا کھایا بس یہی کیا ہم نے تو....."

مرد بھی میرے ابا کی ہمت کی داد دے رہے تھے۔ "بھئی تم پہلے آدمی ہو مزدوروں کی اس بستی میں جو بیٹی کو اتنا قیمتی اور شاندار سامان دے کر رخصت کرو گے....."

میری ماں اور ابا انکساری سے کہتے "ہم نے کیا دینا تھا۔ بھلا ہو ان کا جنہوں نے قیو کی شادی پر دل کھول کر دیا..... بیگموں اور صاحبوں نے بڑی مدد دی ہے۔"

ہر انہونی بات پر چرچے ہوتے ہی ہیں۔ بیڈ پر بھی قیاس آرائیاں ہونے لگیں۔ باتیں بننے لگیں۔ بیڈ کو ہضم کرنا ان لوگوں کے بس میں نہیں تھا۔ آج تک تو جتنی لڑکیاں بیاہی گئی تھیں کسی کو ڈھنگ کی چارپائی بھی میسر نہ آئی تھی..... غریب لوگ جو دن رات محنت مشقت کرتے تھے بمشکل دو وقت کی روٹی کھا سکتے تھے۔ اس بستی میں کوئی مزدور بھی ایسا نہ تھا۔ جسے فارغ البال کہا جا سکتا..... عورتیں بھی کام کرتیں تھیں..... لیکن پوری نہ پڑتی تھی..... اس لئے کہ بچوں سے گھر بھرے تھے۔ پیسے کی نہیں بچوں کی بہتات ضرور تھی.....

"اے برکتے۔ اتنے پیسوں کا پلنگ لے آئی..... اچھا نہیں تھا۔ قیو کے لئے سونے کے بندے بنوا لیتی....." کوئی کہتی۔

"بندے کیا دو چوڑیاں بن سکتی تھیں۔" حیران حیران عورتیں اماں سے کہتیں۔

اماں جواب دے دے کر تھک گئی۔ تو سب سے یہی کہنے لگی۔ "باجی شائستہ نے خود ہی بیڈ خریدا ہے قیو کے لئے....."

اس کا جواب بھی عورتوں کے پاس گھڑا رکھا تھا۔ "اے ہے..... باجی شائستہ سے کہنا تھا پہلے اس بستی میں آ کر دیکھ تو لیتی..... یہ شاندار بیڈ ان گھروں میں سجتا بھی ہے کیا؟"

مجھے

نہ تو ان عورتوں کے تبصروں کی پرواہ تھی نہ تمسخر کی..... مجھے تو اماں ابا کے خرچوں کا بھی احساس نہ تھا..... کہ شادی پر اٹھنے والے دیگر اخراجات کا وہ کیا کر رہے ہیں..... میں تو بس خوش تھی۔ کہ وہ فوم کے گدے والا پلنگ جس کی خواہش میرے اندر تنومند ہو چکی تھی آ گیا

تھا..... برسوں بعد مجھے تسکین نصیب ہوئی تھی اور اس دلہن بیگم کے تمسخرانہ اور حقارت آمیز قہقہے نے جو میرے ننھے سے ذہن میں کانٹوں کی چبھن بھر دی تھی۔ وہ دور ہو گئی تھی۔ مجھے لگتا تھا۔ میں ادھوری تھی اب مکمل ہو گئی ہوں۔

میری شادی ہو گئی..... میں خیرو کے گھر آ گئی..... اس کی کوٹھڑی میں بیڈ لگانا مشکل تھا۔ دروازہ چھوٹا تھا بیڈ بڑا۔ اس لئے اسے کھول کر اندر ڈالا گیا..... اس بات پر بھی لوگوں نے تمسخر اڑایا۔ لیکن خوشی کا اپنا ہی وجود ہوتا ہے۔ اپنا ہی تاثر ہوتا ہے۔ میں خوشی سے مالا مال تھی۔ کہ دلہن تھی اور دلہن کا مقدر فوم کے گدے کے بیڈ پر سونا ہوتا ہے۔ میرے ذہن میں تو یہی بات جاگزیں تھیں.....

اور

واقعی

جب میں اس بیڈ پر سوئی

تو

میری نیند ویسی ہی پرسکون اور گہری تھی۔

جیسی

بچپن میں دلہن بیگم کے بیڈ پر سو کر آئی تھی..... میں سنہرے دیش میں سنہرے اڑن کھٹولے پر پریوں کی شہزادی بن کر اڑتی رہی.....

میں واقعی شہزادی تھی۔ نہ تو اڑن کھٹولا ڈولا تھا۔ نہ ہی میں فضاؤں سے چکراتی زمین سے آ ٹکرائی تھی۔

کیونکہ آج جب میری آنکھ کھلی تو نہ ہی کسی نے میرے بالوں میں مٹھو بھر کر مجھے جھٹکے دیئے تھے۔ نہ ہی کسی نے غصے سے پھنکارتے مجھے دھکے دے کر بیڈ سے نیچے گرایا تھا۔ کسی نے کوسنے بھی نہیں دیئے تھے اور تمسخرانہ حقارت آمیز قہقہہ بھی نہیں لگایا تھا۔

بلکہ

آج تو جب میری آنکھ کھلی تھی۔

خیرو مجھ پہ جھکا آنکھوں میں چاہتوں اور محبتوں کا خمار لئے کہہ رہا تھا۔ "قیو دن اتنا نکل

www.freepdfpost.blogspot.com

آیا ہے اب تو اٹھ جا....."

خیر و میرا شوہر.... شاید میں چارپائی پر بھی سوئی ہوتی۔ تو مجھ پر چاہتیں اور محبتیں لٹاتے ہوئے یہی باتیں کہتا.....

لیکن

تب

شاید میں اتنا سرور ایسا سکون اور ایسی تسکین محسوس نہ کرتی.....

اس لئے کہ اب میرے اندر تمسخرانہ قہقہے کی چبھن اور جلن بدستور ہوتی.....

وہ

اب نہیں تھی۔ اور میں پر سکون تھی۔ خوش تھی۔ مکمل لگ رہی تھی۔ اور بالکل ہلکی پھلکی ہو گئی تھی خوشی کا مول میرے ماں باپ نے چکایا تو تھا۔ لیکن خوشی کے مقابلے میں وہ اتنا زیادہ بھی نہیں تھا۔

رضیہ بٹ

لاہور

PdfStuff.blogspot.com

www.freepdfpost.blogspot.com